مقالاتِ سجادؒ

تصحیح وتقدیم

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

امارت شرعیہ بہار واڑیسہ
پھلواری شریف پٹنہ

GIFT

سلسلہ آثار سجاد

مقالات سجادؒ

متفرقات
۱۵۱

جمع و ترتیب

محمد ضمان اللہ ندیم

تصحیح و تقدیم

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ
پھلواری شریف، پٹنہ

पटना-6

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	مقالات سجادؒ
تالیف	:	مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ
جمع وترتیب	:	محمد ضمان اللہ ندیم
تصحیح و تقدیم	:	مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
کمپوزنگ	:	انوار الوفا اعظمی
صفحات	:	۱۶۵
قیمت	:	
تعداد اشاعت	:	ایک ہزار
سن اشاعت	:	مارچ ۱۹۹۹ء / ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ
ناشر	:	امارت شرعیہ بہار واڑیسہ
ملنے کا پتہ	:	امارت شرعیہ بہار واڑیسہ پھلواری شریف پٹنہ، بہار

مطبع: بھارت آفسیٹ، دہلی ۶

فہرست مقالات سجادؒ

GOVT. URDU LIBRARY
ACC. N 27288
Date
PATNA

سیاسی مقالات

اصلاحی مقالات

پیش لفظ

آپ کے سامنے مختلف موضوعات پر مولانا سجادؒ کے علمی مقالات اور تحریروں کے نمونے ہیں جو وقیع فکری و علمی ذخیرہ اور سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں فکر اسلامی کے بیش قیمت جواہر بھرے ہوئے ہیں۔ ان تحریروں میں عظیم مفکر کی جولانی طبع، وسعت فکر، تدبر، گہرائی و گیرائی، اجتہادی روح کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے جو مولانا سجادؒ کی امت کی اصلاح و تعمیر، شوکت وقوت کے لئے بے قراری و بے چینی کا مظہر ہیں۔

مولانا سجادؒ کی فکر دراصل امت کے اتحاد، تعمیر، شوکت وسطوت اور ہندوستان میں ملت کی سیاسی حکمت عملی کے گرد گھومتی ہے۔

توقع ہے کہ ملت اسلامیہ مولانا کے پیغام کو صحیح تناظر میں سمجھے گی اور جدید ہندوستان کی تعمیر میں اس سے فائدہ اٹھائے گی۔

خدا کرے آئندہ مولانا سجادؒ کے دیگر مقالات اور تحریریں بھی شائع ہوجائیں اور یہ سلسلہ قائم ودائم رہے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

نزیل ذاکر باغ، نئی دہلی

ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی

مسلمانوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ:

ہندوستان کا دستور اساسی سمندر پار تیار ہو رہا ہے جو ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء رائج ہو جائے گا اور اگرچہ اس دستور کو اس کی موجودہ شکل میں تقریباً تمام بیدار مغز سیاسئین نے ناقابل قبول بتایا ہے۔ مگر یہ امر متحقق ہے کہ یہی دستور حکومت ملک میں رائج ہو کر رہے گا، اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں اصولی تبدیلی کی کوئی صورت کب تک پیدا ہو سکے گی۔

سیاسی اور اقتصادی اختیارات کی حیثیت سے یہ دستور جس قدر ناقص ہے۔ وہ سب پر واضح ہے اور اس مضمون پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ بحیثیت مسلمان جس نقطۂ نظر سے دستور پر غور کرنا چاہئے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اس وقت اس امر کی طرف توجہ دلانا ہے کہ برطانوی حکومت کے گذشتہ دور میں مسلمانوں کے خاص مذہبی معاملات اور مذہبی معاشرت کے ساتھ باوجود آئینی حکومت

کے جو کچھ سلوک ہوتا رہا وہ تو ہو چکا۔ کیا اب آئندہ دستور میں کوئی ایسی ضمانت موجود ہے جس کی بنا پر یہ توقع ہو کہ اب آئندہ تمدن اور اصلاح معاشرت کے خوش نما اور پر فریب ناموں سے اسلامی تمدن و معاشرت کی تخریب نہ ہو سکے گی؟

اس کا جواب نہایت صاف یہ ہے کہ آئندہ دستور میں بھی اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ بلکہ قرطاس ابیض کے بعد جوائنٹ پارلیمنٹری رپورٹ کے مباحث اور سفارشات (جن کی روشنی میں دستور بنایا جا رہا ہے) نے مزید بے اطمینانی پیدا کر دی ہے۔ اور یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ جو حضرات اسلامی تمدن و معاشرت کے بجائے مغربی تمدن و معاشرت اختیار کرنا چاہتے ہیں، ان کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ وہ دل کھول کر مذہبی پابندیوں اور حدود اللہ کی قیود سے جدید دستور کے ماتحت آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ بلکہ ایک حد تک اس کی طرف ان کی رہنمائی کی گئی ہے جس کا ثبوت میں آئندہ دوں گا۔ مگر اس سے پہلے مختصراً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جمعیۃ علمائے ہند اور تمام اسلامی جماعتوں نے آئینی اور دستوری طریق پر مذہبی تحفظ کیلئے جو صورت تجویز کی تھی یہ تھی کہ آئندہ دستور میں ایک دفعہ بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کی ہو جس میں دیگر قوموں کے بنیادی حقوق کی صراحت کے علاوہ مسلمانوں کے بنیادی حقوق کی تفصیلات درج ہوں اور اصولی طور پر یہ وضاحت ہو کہ مسلمانوں کے خاص باہمی معاملات اور معاشرتی رسم و رواج جو مذہبی احکام کے ماتحت ہیں اس میں کسی

قسم کے تغیر و تبدل کا اختیار کسی حکومت اور مجالس قانون ساز کو نہ ہوگا اور نہ اس کے متعلق کوئی قانون پاس ہو سکے گا اِلّا یہ کہ مسلمان خود اپنے مذہبی احکام کی پابندی یا ان کی ترویج کے لئے کوئی مسودہ قانون پیش کر سکیں گے۔ اور اس سلسلہ میں نکاح، طلاق، تفریق زوجین، مساجد، خانقاہیں اوقاف سے لے کر قبرستان تدفین میت تک عنوانات کی تفصیل دی گئی تھی تاکہ برطانوی حکومت و دستور میں قانونی طور پر اس کو درج کر دیا جائے۔

اگر حکومت جدید دستور میں شامل کر لیتی تو پھر حکومت یا کسی مجلس قانون ساز کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کوئی ایسا مسودہ قانون بنائے جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہو اور اس کا اثر مسلمانوں کے مذہبی احکام پر پڑے اگر کوئی مجلس قانون ساز ایسا کرتی تو نہایت آسانی کے ساتھ ہائی کورٹ، فیڈرل کورٹ یا سپریم کورٹ سے اس قانون کے ناجائز ہونے کا اعلان کرایا جانا ممکن ہوتا، مگر افسوس ہے کہ حکومت برطانیہ اور اس کے نمائندوں نے مسلمانوں کے اس جائز اور صحیح مطالبہ کو نامنظور کر دیا اور جدید دستور میں بنیادی حقوق کا کوئی ذکر نہیں کیا، اس لئے اسلامی مذہبی تحفظ کی کوئی ضمانت اس دستور میں موجودہ کی طرح آئندہ بھی نہیں ہوگی۔

جوائنٹ پارلیمنٹری رپورٹ کے پیراگراف (۳۶۶) میں (اس امر کے اعتراف کے باوجود کہ جنگ عظیم کے بعد جو دستور ہائے حکومت مدون ہوئے

ہیں، ان میں بنیادی حقوق کی تفصیل دی گئی ہے) اس سے صاف انکار کر دیا گیا کہ ہندوستان کے دستور میں بنیادی حقوق کی تفصیل درج نہ ہونی چاہئے، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ کم از کم اس رپورٹ کے اس پیراگراف کا بغور مطالعہ کریں اور نئے دستور کی اس نوعیت کو ضرور پیش نظر رکھیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مذہبی تحفظات کا کوئی اور طریقہ سوائے اس کے ممکن ہی نہیں تھا کہ دستور اساسی میں مستقل دفعات کو بنیادی حقوق کے ماتحت درج کرایا جاتا اور جیسا کہ ابھی عرض کیا جاچکا ہے تمام اسلامی جماعتوں نے اس مطالبہ کو متفقہ حیثیت سے پیش بھی کیا تھا، مگر حکومت برطانیہ کے مدبرین نے اس مطالبہ کو مسترد کر کے ہندوستان کے اندر قانون کی دستبرد سے مذہب کو آزاد رکھنے کے تمام امکانات کو ختم کر دیا اور اب جب کہ پارلیمنٹری رپورٹ کی سفارشات کے مطابق جدید دستور اساسی مرتب ہو کر ہمارے سامنے آچکا ہے، اور ہم ان مباحث و دلائل کا نتیجہ بھی دیکھ رہے ہیں جو مذکورہ بالا رپورٹ میں خاص طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ آٹھ کروڑ مسلمانان ہند کی یہ خواہش کہ ان کے مذہب میں کسی قسم کی آئینی مداخلت نہ کی جائے اور اس اصول کو صاف الفاظ میں دستور اساسی کے اندر داخل کر دیا جائے، پامال کر دی گئی ہے۔ میں نے جس وقت پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ کو پڑھا ہے تو سب سے پہلے میرے لئے یہی مسئلہ جاذب توجہ تھا اور میں ان تمام مسلمانوں سے جو

تحفظ حقوق مسلمین کے دعویدار ہیں یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ اس طرف پوری طرح متوجہ ہو جائیں گے، مگر مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس طرف ان حضرات نے کوئی توجہ نہیں کی حالاں کہ یہ مسئلہ تمام ہندوستان کی اسلامی زندگی کے لئے ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔

پارلیمنٹری رپورٹ لکھنے والوں نے مسلمانوں کے مذہبی احکام میں دست اندازی کے دروازہ کو کھلا رکھنے کے لئے بنیادی حقوق کی صراحت سے جو انکار کیا ہے اس کے وجوہ عجیب و غریب بیان کئے ہیں جن کو دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے کہ وہ کس قدر احمقانہ باتوں سے ہندوستانیوں کو بہلا دینا چاہتے ہیں، مصنفین رپورٹ کا ارشاد ہے کہ:

> "گذشتہ دس سال کی تاریخ بتاتی ہے کہ حقوق "کو تباہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کے وجود کا آئین میں اقرار کیا جائے گا"۔

خوب اگر یہی منطق صحیح ہے تو آپ حضرات کا کیا ہرج تھا، برطانوی حکومت کا کوئی نقصان نہ ہوتا اور مسلمان خوش ہو جاتے۔ پھر اگر آپ کے نزدیک یہی منطق صحیح ہے تو سول ملازمین اور اینگلو انڈین حضرات کے حقوق کے آپ اس قدر کیوں دشمن ہو گئے کہ آپ نے ان کے لئے سفارشات کی ہیں کہ ان کی حفاظت کے لئے دستور میں خاص دفعات ہوں۔ گورنر اور گورنر جنرل کو خاص ہدایات دی جائیں وغیرہ وغیرہ۔

گویانام نہاد صوبوں میں جو ذمہ دار حکومت دی جارہی ہے تو اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ غریب ہندوستانیوں کی صنعت و حرفت تجارت وزراعت انگریزی حکومت کی گراں باری سے جس طرح تباہ ہو چکی اور عمومی جہالت مسلط ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاق اور خودداری فنا ہو گئی ہے، اس کی مکافات واصلاح ممکن ہو، بلکہ اصلی مقصود یہ ہے کہ:

> "اسے (یعنی معاشرتی رسم ورواج جو مذہبی عقائد سے وابستہ ہیں ان میں ترمیم واصلاح) کسی کامیابی کی امید کے ساتھ صرف ذمہ دار حکومت میں انجام دیا جاسکتا ہے"۔

ہر پابندی سے گریز:

اب نام نہاد ذمہ دار حکومت عطا کئے جانے کے اہم بنیادی اصول سمجھنے کے بعد رپورٹ مذکور کے باب دوم میں (۱۴) پیراگراف میں حسب ذیل عبارت کو بغور پڑھئے۔

> "ہمارا خیال ہے کہ گورنر کی منظوری ایسا قانون پیش کرنے کے لئے ضروری نہیں ہے جس کا تعلق مذہب یا مذہبی رسم ورواج سے ہو ہماری یہ رائے اس لئے نہیں ہے کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ عملاً اس قسم کی منظوری کے لازمی ہونے کی وجہ سے مفید سماجی (معاشرتی) اصلاحات

کی کوششوں پر بُرا اثر پڑے گا... بلکہ اس لئے کہ ہماری رائے میں اس قسم کے قانون کے لئے اور سب قوانین سے زیادہ ضروری ہے کہ ہندوستانی وزراء کی ذمہ داری پر اسے پیش کیا جائے"۔

اور یہ وزراء کون ہوں گے؟ وہی جو مغربی تعلیم سے مسحور اور پھر ان میں اکثریت ایسے غیر مسلموں کی جو اپنے مذہبی قانون کے ناقص ہونے کی وجہ سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ وہ مجالس مقننّہ کے ذریعہ اپنے مذہبی تمدن میں انقلاب پیدا کریں۔ دیگر ارکان بھی اگر آزادانہ طور پر جاتے رہے تو ان کا حال بھی معلوم ہے، اس لئے نتیجہ ظاہر ہے کہ اپنے نقطۂ خیال سے جس قسم کے قوانین بنائے جائیں گے، وہ منظور ہوتے رہیں گے۔ ہمارے غریب مسلمان یا مولوی وشاہ صاحبان چیخ وپکار کرتے رہیں کون سنتا ہے صدائے درویش۔

برطانوی مدبرین کی اولوالعزمی:

اب اس اہم معاملہ میں مصنفین رپورٹ کی اولوالعزمی اور ہمت ملاحظہ فرمایئے، آگے ارشاد ہوتا ہے:

"ہم نے کسی دوسری جگہ اپنی اس رائے کے متعلق دلائل بیان کئے ہیں کہ سماجی اصلاح کے معاملات جو بالواسطہ یا براہ راست ہندوستان کے مذہبی عقائد سے تعلق رکھتے ہوں ان کی کامیابی کی امید بھی اسی صورت میں ہے کہ ہندوستانی وزراء ان کی ذمہ داری اپنے اوپر لیں اور

جب کہ ایسا ہو تو ہمیں یہ نامناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس نہایت ہی اہم معاملہ کی ذمہ داری میں گورنر بھی ان کا شریک بن جائے"۔

اللہ اکبر! ہندوستانیوں کی عزت وخودداری کا کس قدر خیال ہے مگر یہ نظریہ صرف معاشرتی قوانین کے متعلق کیوں ہے۔ دیگر ضروری معاملات میں اس بلند خیالی کا ثبوت کیوں نہیں دیا جاتا، بہر حال اب یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ اسلامی احکام معاشرت جس میں ازدواج، نکاح وطلاق وراثت وحضانت، شرعی پردہ وغیرہ کے احکام داخل ہیں ان میں تغیر وتبدل کرنے کی طرف کس طرح رہنمائی کی گئی اور آئندہ دستور کے ماتحت اس باب میں کتنی گنجائش رکھی گئی۔

اب اگر شاید کسی بد نصیب مسلمان کو بدگمانی ہو کہ گورنر جنرل جو تنہا حقوق اقلیت کے محافظ قرار دیئے گئے ہیں وہ اپنے مخصوص اختیارات سے اس قسم کے قوانین کی آخری منظوری نہ دیں گے تو ان کو بھی آج ہی اپنے خیال سے مایوس ہونا چاہئے کیوں کہ باب دوم "گورنروں کی مخصوص ذمہ داری کی نوعیت کے عنوان کے ماتحت (۷۹) پیراگراف میں اقلیت کے جائز مفاد کا تحفظ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"پھر بھی غلط فہمی کے ازالہ کی خاطر ہم سفارش کرتے ہیں کہ ہدایت نامہ میں اس کو صاف کردیا جائے اور اس بات کو بھی کہ اس اختیار

خصوصی کا منشا یہ نہیں ہے کہ گورنر کسی معاشرتی یا اقتصادی اصلاح کے راستے میں صرف اس لئے رکاوٹ ڈالے کہ اس کی مخالفت لوگوں کی ایک جماعت کی جانب سے ہو رہی ہے جو کہ اپنے آپ کو ایک اقلیت کہلانا چاہتے ہیں"۔

بد سے بد تر حالت:

اب تو ہر مسلمان کو یقین ہونا چاہئے کہ معاشرتی قوانین جو مذہبی احکام پر اثر انداز ہوتے ہوں اس کے متعلق گورنر کی پالیسی کیا رہے گی اور اقلیتوں کی چیخ و پکار، بیکار محض ہو گی۔

ان حقائق کے واضح ہونے کے بعد میں تمام ان مسلمانوں کو جو کہ اسلامی تمدن و معاشرت (جو محض رسم و رواج نہیں بلکہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کے ماتحت ہیں) کی حفاظت ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے لئے دنیا کی بڑی سے بڑی متاع کو قربان کر دینا فرض سمجھتے ہیں یہ دعوت دیتا ہوں کہ خدا کے لئے وہ بتائیں کہ آئندہ دستور کے ماتحت دستوری طور پر اس اہم مقصد کے حصول کے لئے کیا طریقہ تجویز کرتے ہیں۔ حنفی ہوں یا اہل حدیث، شیعہ ہوں یا سنی، بریلوی ہوں یا دیوبندی صوفی ہوں یا زاہد خشک، بہر حال کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، ہر ایک سے میری درخواست ہے کہ ان حقائق پر تمام ذاتی وجاہت و اغراض سے بالاتر ہو کر اپنے اصول سے کوئی مؤثر اور قابل عمل تدبیر بتائیں تا کہ اس پر عمل کرنے

کی سعی کی جائے اور سب لوگ مل کر اس پر عمل کریں۔

مضحکہ خیز استدلال:

اسی طرح مصنفین رپورٹ کا استدلال بھی نہایت مضحکہ خیز ہے کہ:

> "ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ریاستوں نے نہایت صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ ریاستوں کی حدود میں بنیادی حقوق کا اعلان فیڈریشن کے صرف ایک حصہ میں ہو"۔

اگر ریاستوں نے انکار کیا تھا تو اس میں کیا مضائقہ تھا کہ صرف برطانوی ہند کے باشندوں کے بنیادی حقوق کا اعلان کر دیا جاتا۔ اس میں مضحکہ خیزی کی کون سی بات ہے۔ کیا جتنی سفارشات مصنفین رپورٹ کی ہیں ان میں برطانوی ہند اور ریاستوں کے مابین کوئی تفریق و امتیاز نہیں ہے۔ ہے اور بہت کافی ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان معاملات میں تفریق تو مضحکہ خیز نہ ہو اور بنیادی حقوق کے باب میں یہ امتیاز و تفریق مضحکہ خیز ہو جائے۔ اس کے علاوہ آخر ملازمت اور ذاتی ملکیت کے متعلق جو بنیادی حقوق میں ان کی سفارش کیوں کی گئی ہے۔ اس میں نہ کوئی دشواری پیش آئی اور نہ کوئی مضحکہ خیز نظر آئی بلکہ (۲۶۷) پیراگراف میں حقوق ملازمت کے بارے میں جو سفارش ہے وہ تو ریاستوں تک وسیع ہے اور یہ سفارش کرتے ہوئے ریاستوں کے انکار کا خیال دامنگیر نہیں ہوا۔

حقیقت حال:

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کچھ بھی عقل دی ہے وہ یقیناً سمجھے گا کہ یہ سب عذرات محض لغو ہیں اور اصل حقیقت یہ ہے کہ برطانوی حکومت کا مقصد یہ ہے کہ مذہبی حسیات و جذبات کو پامال کرنے کا موقع ہمیشہ باقی رہے۔ چنانچہ آخر ایک حق بات مصنفین رپورٹ کے قلم سے نکل ہی گئی ہے یعنی مسلمان اپنے مذہب کی حفاظت جس طریق سے چاہتے ہیں اس کو برطانوی حکومت کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔ اگرچہ پیچ در پیچ عبارت میں اس حقیقت چھپانے کی پوری کوشش کی گئی ہے، مصنفین رپورٹ لکھتے ہیں:

> "بنیادی حقوق کا ذکر مجمل طریقہ سے ہوگا جس کا قانونی اعتبار سے کوئی خاص اثر نہ ہوگا یا پھر اسکے قانونی اثرات مجلس قانون ساز کے دائرہ کار پر بہت کافی قیود عائد کرنے کا باعث ہوں گے اور اس کے اکثر قوانین عدالتوں کے ذریعہ ناجائز قرار دیدیئے جائیں گے، اس لئے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ان حقوق کے منافی ثابت کئے جا سکیں گے جن کی وضاحت اس میں ہوگی"۔
>
> (پیراگراف (۲۶۶) جلد اول)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر بنیادی حقوق کی دفعہ کو دستور میں داخل کر دیا گیا تو مداخلت مذہبی کا دروازہ کامل طور سے ہمیشہ کیلئے بند ہو جائے گا

کیااس کے بعد بھی کسی کو شبہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے مذہبی حیثیت سے آئین اور دستور میں جو چیز ضروری تھی وہ صرف بنیادی حقوق کی صراحت تھی۔ جس کے لئے جمعیۃ علمائے ہند کے محترم ارکان ابتداء سے آواز بلند کر رہے ہیں، مگر وہ برطانوی حکومت کو منظور نہیں ہے۔ کیوں کہ اس سے مذہبی مداخلت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کی خوش عقیدگی:

مگر افسوس ہے کہ مسلمان لیڈر اس چیز کی اہمیت کو آج تک نہیں سمجھتے یا وہ قصداً غفلت شعاری سے کام لے رہے ہیں، یا یہ خیال کیا جائے کہ بعض مسلمان لیڈر خود ایسے ہیں جو اگرچہ اسلام اور مذہب کا نام محض عوام کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے لیتے ہیں ورنہ وہ خود اس آزادی کے خواہاں ہیں کہ قرآن واحادیث کے احکام تمدن و معاشرت میں تغیر و تبدل کیا جائے جو مجالس قانون ساز کے ذریعہ بآسانی حاصل ہوگا، بہر حال یہ تو معلوم ہو گیا کہ آئندہ دستور میں مذہبی تحفظ کا جو اصل ذریعہ بناوہ نہ ہوگا مگر شاید کسی کو یہ خوش عقیدگی ہو کہ خود مجالس مقننہ مذہبی مداخلت کی ہمت نہ کرے گی یا اگر وہ ایسی جرأت کرے تو گورنر اور گورنر جنرل اپنے مخصوص اختیارات کے ماتحت اس کو رد کردیں گے۔

اگرچہ سارداایکٹ اور قوانین متعلق حج کے پاس ہونے اور ان پر عمل

در آمد کے بعد کسی مسلمان کے لئے اس امر کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ وہ اس درجہ خوش عقیدہ رہے، تاہم اگر اب بھی کوئی مسلمان اس درجہ خوش عقیدہ ہے تو میں اس کی اصلاح خیال کی غرض سے جوائنٹ پارلیمنٹری رپورٹ کی سفارشوں سے یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ بجائے خوش عقیدگی کے اب وہ یہ یقین کرے کہ گذشتہ زمانہ کی بہ نسبت مذہبی مداخلت کا راستہ وسیع تر کر دیا گیا ہے، اور اس عظیم الشان کام کی طرف مغرب زدہ لوگوں کو خاص توجہ دلائی گئی ہے۔

معاشرتی قانون سازی:

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس رپورٹ کا اٹھارہواں پیراگراف اول سے آخر تک پڑھنا چاہئے، اگرچہ یہ بحث سفارشات سے خارج ہے، مگر باب اول آئینی بندوبست کے اصول بحث میں ہے اور آئینی اصولوں کے ماتحت آئندہ ابواب میں سفارشات پر بحث رہے، واقفیت عامہ کے لئے اس جگہ اس پیراگراف کا پورا ترجمہ درج کرنا مناسب ہے تاکہ ہر شخص اچھی طرح خود بھی غور کرے کہ مصنفین رپورٹ ہندوستانیوں کی کس طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔

> ”دوسری بات یہ ہے کہ معاشرتی قانون سازی کے حلقے میں ظاہر ہے کہ ایک مقام ایسا آن پہنچا ہے جہاں مزید ترقی کا دارومدار اس امر پر ہے کہ ہندوستانی اپنے ملک کے معاشرتی حالات کی ذمہ داری اپنے اوپر عائد کرلیں، انگریز صداقت کے ساتھ اس امر کا دعویٰ کرسکتے ہیں کہ اس ترقی کے بڑے حصہ میں ہندوستان پر برطانوی حکومت کا احسان

ہے لیکن ہندوستانی زندگی کے ایک شعبہ سے برطانوی حکومت نے علیحدہ رہنے کی کوشش کی ہے۔ ان تمام معاملات میں جن کا ہندوستان کے مذاہب سے تعلق ہے، اس نے غیر جانبداری اور عدم مداخلت کی حکمت عملی سے کام لیا جائے اس عدم مداخلت کے اصول نے حکومت ہند کو بہت سی اصلاحات رائج کرنے سے باز نہیں رکھا۔ بقول لارڈ لینڈ اورن، ”جہاں کہیں مذہب کے نام پر ایسے مطالبات کئے جاتے تھے کہ ان کے قبول کرنے سے ایسے کاموں کا اجرا ہوتا ہو جو انفرادی حفاظت اور امن عامہ کے خلاف ہوتے اور جنہیں دنیا میں قانون واخلاق کا نظام ممنوع قرار دیتا تو انہیں رد کر دیا جاتا تھا۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ ایک ایسے ملک میں جہاں لوگوں کی عادات ورسوم اس کے مذہبی عقائد سے، اس قدر وابستہ ہیں۔ یہ رویہ خواہ کسی قدر حق بجانب رہا ہو۔ بعض اوقات اس کا باعث ہوا ہے کہ حکومت معاشرتی قوانین کو ایسے معاملات میں موئثر نہ بنا سکی۔ اس کی دو مثالیں بچوں کی شادی اور اچھوتوں کا مسئلہ ہے۔ ان چند برسوں میں یہ امر روز افزوں طریقہ پر ظاہر ہوتا رہا ہے کہ اس قسم کی قانون سازی کے راستہ میں جو رکاوٹیں ہیں (انہیں صرف ہندوستانی ہٹا سکتے ہیں۔ اس کام میں جو دقت پیش آئے گی ہم اس کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں لیکن ہم یہ نہایت اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ سے کسی کامیابی کی امید کے ساتھ صرف ذمہ دار حکومت میں انجام دیا جا سکتا ہے)“۔

(جلد اول باب اول جوائنٹ پارلیمنٹری رپورٹ)

جریدہ نقیب پھلواری شریف

جلد ۳، شمارہ ۷

جلد ۳، شمارہ ۸

اسلام اور مسلم قومیت کے کیا معنی ہیں؟

گاندھی جی غور کریں!

اار نومبر ۱۹۳۹ء کے "ہریجن" میں گاندھی جی نے "اختلاف رائے" کے عنوان سے کسی مسلمان کے خط کے جواب میں ایک مضمون لکھا ہے جس کا اردو ترجمہ اخبار "زمزم" کے ذریعہ میرے سامنے ہے، اس مضمون میں گاندھی جی نے اپنے عقیدہ عدم تشدد کو اسلامی اور قرآنی تعلیم کے مطابق بنانے کی سعی فرمائی ہے اور اس ضمن میں قرآن کریم ورسول اللہ ﷺ کی زندگی کے واقعات اور مذہب و مسلمانوں کی قومیت پر بھی بحث کی ہے اور آخر میں کانگریس کے مطالبہ کو تسلیم کرنے سے جو برطانیہ نے انکار کردیا ہے اس کو وہ اپنے حق میں بھلائی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "اس کی بدولت مسلم لیگ کو موقع مل گیا ہے کہ آٹھ صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کی رکاوٹ دور ہو جانے پر اپنے لئے کوئی راستہ منتخب کرے، اسے دو صورتوں میں سے ایک صورت منتخب کرنی ہوگی ،خواہ ہندوستان کو تقسیم کرکے برطانوی اقتدار کو مستحکم کرکے یا متحدہ ہندوستان کی آزادی کیلئے جد وجہد کرے"۔ مسلم لیگ کے متعلق گاندھی جی نے خود

دوراستے تجویز کئے ہیں اس کا جواب مسلم لیگ دے گی یا آئندہ کے واقعات دیں گے، مسلم لیگ کے ہائی کمانڈ کی ذہنیت اور عملی زندگی کی بناء پر جواب تک رہے ہیں، میں اپنی رائے یہ رکھتا ہوں کہ وہ کچھ نہ کرے گی، باقی رہا برطانیہ کے انکار سے کانگریس کے حق میں بھلائی ہونا تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس میں سراسر نہ صرف کانگریس بلکہ ملک کا بھی فائدہ ہی فائدہ ہے۔

کانگریس کے مخالفین اور دشمنان آزادی نے جو یہ غلط فہمی پھیلائی تھی کہ کانگریس وزارتوں سے چمٹ گئی ہے، اس کا انتہائی مقصود حاصل ہو گیا، آزادی کا دعویٰ ایک ڈھونگ ہے، اس قسم کی تمام غلط فہمیوں کے دور ہونے کا موقع برطانیہ کے انکار نے پیدا کر دیا کہ کانگریس یکدم آٹھ صوبوں کی حکومت چھوڑ کر ہٹ گئی جس سے غلط فہمی پھیلانے والوں کے منہ بند ہو گئے۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۸ء کے جمہوری ہونے کا غلغلہ بلند کیا جارہا تھا، اس کا راز فاش ہو گیا اور آج ہندوستان کے سات صوبوں میں محض شخصی حکومت جو ہو رہی ہے وہ اسی جمہوری ایکٹ کے ماتحت ہے، نیز کانگریس کی وہ بات بھی ایک حد تک پوری ہوئی کہ اس نے وزارت اس ایکٹ کو مسترد کرانے کے لئے قبول کی ہے کیوں کہ برطانیہ نے اس ایکٹ میں ترمیم و تنسیخ کا وعدہ کر لیا جو بحیثیت مجموع اس ایکٹ کے استرداد کے وعدہ کے مترادف ہے، یہ بات محض کانگریس کے اقتدار اور قبول وزارت کے ذریعہ ملک کو حاصل ہو گئی اور صرف

گفت و شنید اور کاغذی جنگ سے ملک نے آزادی کی طرف ایک قدم آگے بڑھایا اور قرینہ ہے کہ اگر برطانیہ نے کانگریس کے مطالبہ کو پورا نہیں کیا تو کانگریس کو مجبوراً عملی جد و جہد میں مبتلا ہونا ہوگا، اور جمعیۃ علماء ہند و دیگر آزادی خواہ جماعتیں بھی میدان عمل میں آئیں گی۔ اس وقت کے آنے پر مسلم لیگ کے آزمائش کی بھی ایک آخری گھڑی ہوگی کہ وہ بھی مکمل آزادی کی مدعی ہے، بہر حال گاندھی جی کے اس نقطۂ نگاہ سے کلیۃً متفق ہوں اور ان کی اس مسرت میں شریک ہوں کہ برطانیہ نے مقاصد جنگ کی صاف صاف تشریح سے گریز کر کے کانگریس اور تمام اہل ہند کو نادانستہ طور پر فوائد پہونچائے۔ لیکن اسلامیات اور اسلامی قومیت کے متعلق گاندھی جی کا جو نقطۂ خیال ہے، وہ کسی طرح درست نہیں ہے، مگر افسوس ہے کہ ان مسائل پر اس وقت مفصل بحث کا موقع نہیں ہے اور نہ اخباری کالم اس کے متحمل ہو سکتے ہیں، اس لئے اختصار کے ساتھ غلط فہمیوں کو دور کرتے ہوئے گاندھی جی کو ان مسائل پر مزید غور و فکر کی دعوت دیتا ہوں، گاندھی جی کسی مسلمان کے اس قول کے جواب میں کہ: ''اسلام بعض حالتوں میں طاقت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے'' لکھتے ہیں کہ مجھے کوئی شبہ نہیں کہ یہ خط بے شمار تعلیم یافتہ مسلمانوں کے موجودہ رجحان کا آئینہ دار ہے، میں قرآنی آیات کی تفسیر کے متعلق بحث نہیں کرنا چاہتا، غیر مسلم ہونے کی وجہ سے میں ایسا نہیں کر سکتا، اگر میں دلیل پیش کروں تو قدرتی طور پر مجھے جواب دیا

جائے گا کہ تم غیر مسلم ہوتے ہوئے قرآنی آیات کی تفسیر کس طرح کر سکتے ہو اور اگر میں اس کے جواب میں یہ جواب دوں کہ جس طرح مجھے اپنے مذہب کا احترام ہے اسی طرح مجھے اسلام اور دوسرے مذاہب کا احترام ہے تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

پھر آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ میں اپنے نامہ نگار کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ میرے پیش نظر جنگ بدر اور پیغمبر اسلام کی زندگی کے ایسے واقعات ہیں، میں قرآنی کی آیات سے بھی آگاہ ہوں جو میرے نظریہ کی تردید کرتی ہیں، تاہم میرا خیال ہے کہ کسی کتاب یا کسی شخص کی زندگی کی تعلیم کتاب اور زندگی کے واقعات سے مختلف ہو سکتی ہے۔

گاندھی جی کے نامہ نگار نے اپنے خیال کی تائید میں مولانا آزاد کے کسی عدالتی بیان کا بھی حوالہ دیا تھا، اس کا جواب دیتے ہوئے گاندھی جی لکھتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ مولانا نے مذکورہ بالا عدالت میں کیا بیان دیا لیکن یہ ثبوت میرے اس اعتقاد (عدم تشدد یا اہنسا) پر اثر انداز نہیں ہو سکتا جو مجھے کئی سالوں سے قرآنی تعلیم سے حاصل ہے، اختلافات تادم آخر رہیں گے اس سلسلہ میں باہمی رواداری کے لئے ملتجی ہوں۔

گاندھی جی کے مذکور الصدر مضمون سے حسب ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

۱۔ عدم تشدد یا اہنسا، اس تعبیر کے ساتھ جو گاندھی جی خود بیان کرتے ہیں اور جو ان کا عقیدہ ہے وہ کئی سالوں سے قرآنی تعلیم سے حاصل ہوا ہے، یعنی قرآن میں بھی اس قسم کے عدم تشدد یا اہنسا کی تعلیم ہے۔

۲۔ قرآن کریم کی آیات جن سے گاندھی جی کے نظریہ کی تردید ہوتی ہے ان کے نزدیک قابل لحاظ نہیں ہے کیوں کہ کسی کتاب میں ایسا اختلاف ہونا کوئی ہرج نہیں ہے۔

۳۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی زندگی کی تعلیم ان کی زندگی کے واقعات اور اس کتاب سے مختلف ہو سکتی ہے جس کے متعلق اس کتاب اور نبی کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ و تبارک کی کتاب ہے، اس اختلاف میں ان کے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے۔

۴۔ گاندھی جی قرآن کریم کی آیات پر بحث کر کے اپنا عقیدہ اپنے تعبیر کے مطابق ثابت کر سکتے ہیں، مگر وہ اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ محض ان کے غیر مسلم ہونے کی وجہ سے ان کی تعبیر کو رد کر دیا جائے۔

۵۔ گاندھی جی مذہب اسلام کا اسی طرح احترام کرتے ہیں جس طرح اپنے مذہب کا یعنی ایک انسان بیک وقت دو متضاد مذہب کا احترام کر سکتا ہے۔

میں قرآنی تعلیم اور انسانی فلسفہ زندگی کی روشنی میں پوری ذمہ داری کے ساتھ گاندھی جی کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ یہ پانچوں باتیں کسی طرح

درست نہیں ہیں، اگر ان پانچوں خیالات پر اصلاح کے لئے تفصیل سے بحث کی جائے تو غیر معمولی طوالت کے علاوہ شاید گاندھی جی کے حق میں سود مند نہ ہو، کاش گاندھی جی جس طرح سیاسی اور اچھوت اڈھار وغیرہ کے کاموں میں گہری دلچسپی کے ساتھ غور و فکر سے کام لیتے ہیں، اسی طرح اپنا کچھ عزیز وقت ان سوالوں کے حل کرنے پر غور کرتے کہ عالم انسانی کے لئے مذہب کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ضرورت ہے تو وہ انسانوں کے کن کن مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہے، پھر یہ غور کرنا ہے کہ اصولی طور پر کن کن اصولوں کی پابندی سے یہ مقاصد باحسن طریق انجام پاسکتے ہیں اور یہ اصول کن کے بتائے ہوئے ہونے چاہئیں۔

اور اگر اس سلسلہ میں مظاہر قدرت کی مدد سے یہ غور فرماتے کہ قدرت نے لاکھوں قسم کی مخلوقات کے لئے جو اصول و قوانین مرتب کردیئے ہیں، کیا قدرت اس قدر غیر منصف ہے کہ اس نے عالم انسانی کے لئے کوئی اصول و قوانین مرتب نہیں کئے، تو یقیناً وہ اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں جس پر انسانی تاریخ کی ابتداء سے اس وقت تک کڑوروں سلیم القلب انسان پہونچتے ہیں اور ان کو معلوم ہوتا کہ تمام انسانوں کے خوشگوار پاکیزہ اور پُر امن زندگی کے لئے قدرت ہی نے ابتدائے آفرینش انسانی سے انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے اصول و ضوابط اور قواعد بنائے ہیں، ان تمام چیزوں کو انسان اپنی صلاحیت اور

استعداد کی مطابقت کے ساتھ قدرتی نظم سے خاص تربیت یافتہ انسانوں کی معرفت پاتا ہے اور یہ محترم حضرات قدرت کی خاص تربیت اور نظر انتخاب کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ تمام انسانوں سے بالاتر ہوتے ہیں، بلکہ قدرت کے اصول و ضوابط و ہدایت کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے، ان کی عملی زندگی قدرت کے اصول و ضوابط جو انسانی زندگی کے مختلف احوال و ظروف کے مناسب ہوتے ہیں، عملی تفسیر ہوتی ہے۔

اور چوں کہ یہ تمام امور صرف قدرت کی طرف سے اس کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں، اس لئے قدرت کی کتاب ہدایت نامہ میں نہ کوئی اختلاف ہو سکتا ہے اور نہ قدرت کے پیغامبر کی زندگی کی تعلیم اور واقعات میں، اگر اس طرح پر گاندھی جی غور کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ دین حق ابتدائے آفرینش عالم انسانی سے صرف ایک ہی ہو سکتا اور واقعۃً وہ ایک ہی ہے جو انسانی اور کتب آسمانی کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔

آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک جو انسانی سلسلہ ہے یہ سب کے سب ایک ہی دین حق کے داعی اور علمبردار ہیں، جس کا نام اسلام ہے اور دنیا کی تمام سچائیاں اس میں داخل ہیں، دنیا کا کوئی عیب کوئی بُرائی اور انسانیت عامہ کو تباہ کرنے والی کوئی چیز اس میں شامل نہیں ہے، یہودیت ہو یا نصرانیت، مجوسیت ہو یا ہندومت یہ سب حقیقۃً انسانی دماغوں کی خود ساختہ چیزیں ہیں،

اس لئے ان پر مذہب کے مقدس لفظ کا اطلاق قدرتی اصلاح کے اعتبار سے تو صحیح نہیں ہے۔

چوں کہ پہلے کے لوگوں نے دین حق کی کتب آسمانی کو اپنے ہوائے نفس کے مطابق ردوبدل کر ڈالا، اور حقیقی تعلیم کو بھلادیا تو قدرت نے محمد رسول اللہؐ کے ذریعہ قرآن کریم کی صورت میں دین حق کی مکمل تعلیم تمام دنیا کے انسانوں کے پاس بھیجی اور اس کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

اگر گاندھی جی تمام امور پر احاطہ کرلیں تو ان پر اسلام اور قرآن کریم کی حقیقت پورے طور پر ظاہر ہو سکتی ہے، قرآن کریم کیا ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے تمام نسل انسانی کے لئے خوش گوار اور پُر کیف اور باامن زندگی کا مکمل دستورالعمل، گویا نظام انسانی اور انسانی مذہب کا مکمل کانسٹی ٹیوشن ہے جس کی تمام دفعات ایک دوسرے سے مرتبط اور اپنے اپنے محل میں عمل در آمد کے لئے لازم یا ضروری ہیں۔

انسانی مذہب کے نظام زندگی کے اس کانسٹی ٹیوشن کا فلسفہ تقنین اس فلسفہ تقنین سے بہت بلند ہے جو لا کالجوں اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے۔

اسی کے ساتھ قرآن کریم اور اس کے تمام متعلقات اصل عربی زبان میں ہیں اور جب تک کوئی انسانی زبان عربی میں کافی دسترس نہیں رکھتا ہو اور اس

کے فلسفہ تقنین سے واقف نہ ہو اور اساتذہ فن کی صحیح تعلیم و تحقیق سے فہم قرآن اور استنباط احکام کی مہارت حاصل نہ کی ہو، اس کے لئے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ قرآن کی آیات کی تفسیر و توضیح کرے۔

اور اگر کوئی شخص بغیر اس مہارت کے حاصل کئے تفسیر کرے تو اصولاً کسی دانشمند انسان کے نزدیک وہ کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ گاندھی جی کو یقین کرنا چاہئے کہ آپ قرآن کریم کی کسی آیت کی کوئی تفسیر کریں اور اس فن کے ماہرین اس کو تسلیم نہ کریں تو اس کی بنا یہ نہیں ہو سکتی کہ وہ غیر مسلم ہیں بلکہ یہ ہوگی کہ آپ نے اس علم کی تشریح میں مہارت حاصل نہیں کی۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ آج ہندوستان میں ہزاروں مسلمان انگریزی تعلیم یافتہ اور قانون داں آپ کی طرح ہیں لیکن قرآن کریم کی تفسیر اور اسلامیات میں ان کی رائے کوئی وقعت نہیں رکھتی، تو اس کی کیا وجہ ہے؟ وہ تو مسلمان بھی ہیں، صرف انگریزی داں مسلمان ہی نہیں، بلکہ بہت سے مولوی بھی جو ایک حد تک عربی علوم سے واقف ہوتے ہیں، لیکن مہارت نہ حاصل کر سکے تو ان کی تفسیر کی بھی کوئی سند نہیں ہو سکتی ہے۔ گاندھی جی کو یقین کرنا چاہئے کہ دین حق جس کی طرف میں اشارات کر رہا ہوں وہی ایک مذہب ہے باقی جو چند طریقہ زندگی انسانوں میں رائج ہیں وہ حقیقت میں مذہب نہیں لیکن ان طریقوں کے جاننے والے اپنے اپنے اختیار کردہ اصولوں کو اگر مذہب کہتے ہیں تو اس پر کسی کو کیا

اعتراض ہو سکتا ہے۔

لیکن بلاشبہ یہ امر ناممکن ہے کہ وہ شخص اپنے اختیار کردہ اصولوں کا بھی احترام کرے اور ٹھیک اس کی ضد کا بھی، کیوں کہ احترام کا مفاد تو یہ ہے کہ وہ اس کو حق تسلیم کر کے انسانی زندگی کے لئے واجب القبول اور قابل عمل سمجھے۔ دین حق کے فرمانبردار کا فرض ہے کہ دیگر مذاہب کی خامیاں اور کمزوریاں اور نقائص ظاہر کرے اور انسانی برادری کی خیر خواہی کرے، نہ یہ کہ ان کا احترام کر کے انسانی برادری کو ہلاکت کے گڑھے میں گرنے دے۔ بلاشبہ اس باب میں طریق کار منصفانہ اور عادلانہ ہونا چاہئے کہ تحریر و تقریر میں دوسرے مذہب اور اہل مذہب پر سب و شتم نہ ہو جس سے قدرتی طور پر بجائے اصلاح فساد پیدا ہوتا ہے۔

لیکن تحریر و تقریر میں تمام باطل چیزوں اور ضلالتوں کی دلائل و براہین کی روشنی میں پوری قوت سے تردید کرنی چاہئے، انسانیت اور شرافت کی دنیا میں یہی طریق عمل، عدل و انصاف اور رواداری کے حدود میں داخل ہیں اور حق و باطل کا یکساں احترام کرنا یا احترام کی دعوت دینا عدل کے خلاف اور رواداری کے حدود سے خارج ہے۔

الغرض اگر گاندھی جی اسلامیات میں مہارت حاصل کر لیتے تو ان کی وہ تمام غلط فہمیاں دور ہو جاتیں اور صبر واستقامت علی الحق کا وہ، وہ مفہوم نہیں

سمجھتے جو لفظ اہنسا میں مضمر ہے اور نہ وقت ضرورت قتال اور جہاد باسیف کے وجوب واستحسان سے انکار کرتے اور نہ ان کو قرآن کریم اور رسول علیہ السلام کی تعلیم اور رسولؐ کی زندگی کے واقعات میں کوئی اختلاف نظر آتا اور نہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کی کوئی تفسیر محض غیر مسلم ہونے کی وجہ سے مانی نہیں جائے گی اور نہ وہ متضاد مذاہب یایوں کہئے کہ حق وباطل کے یکساں احترام کے قائل ہوتے۔

گاندھی جی نے اس مضمون میں اسلامی قومیت پر اظہار خیال فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو علیحدہ قوم سمجھنے کا مسئلہ بحث طلب ہے لیکن میں نے یہ کبھی نہ سنا کہ دنیا میں جتنے مذاہب ہیں اتنی ہی قومیں ہیں، اگر معاملہ ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی شخص جب اپنا مذہب تبدیل کرے تو اس کی قومیت بدل جائے۔ گاندھی جی مسلمانوں کے مستقل قومیت یا یوں کہئے کہ ایک علیحدہ مستقل ملت ہونے کو بحث طلب سمجھتے ہیں، اس کی بنیاد بھی اسلامیات پر عبور نہ ہونا ہے، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن کریم تمام دنیا کے انسانوں کو ایک ہی نسل کے افراد قرار دے کر باعتبار نسل ایک قوم (نیشن) قرار دیتا ہے، تاکہ تمام دنیا کے انسان نظام زندگی کی ایک وحدت سے منسلک ہو جائیں، وہ انسانوں کو اونچ نیچ اور شریف ورزیل نہ باعتبار نسل تسلیم کرتا ہے اور نہ زمین اور جغرافی تقسیم سے انسانی وحدت کو پارہ پارہ کرنا خوش گوار سمجھتا ہے۔

انسانوں کی تقسیم قطعات ارض جیسی بے روح اور بے کیف چیز سے

کیوں کر وابستہ کی جاسکتی ہے۔ یہ تو حقیقت میں انسانیت کی تذلیل و توہین ہے۔ بلا شبہ انسانوں کی تقسیم کسی ایسی ہی چیز سے ہونی چاہئے جو شرف انسانیت کے مناسب ہو اور وہ انسانوں کا بلند ترین اور صحیح ترین آئیڈیل اور عمل ہے جس پر انسانی مدنیت اور انسانی خوشگوار زندگی اور ترقی کا دار و مدار ہو اور وہ آئیڈیل و تخیل اور عملی پروگرام، انسانی مذہب کے لئے وہی ہے جو دنیا کے سامنے قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ پس جو لوگ اس الٰہی آئیڈیل کو اعتقاداً و عملاً قبول کریں گے وہ قدرتاً و طبعاً انسانوں کے ایک مستقل ملت اور مستقل گروپ اور مستقل قوم میں خود بخود منتقل ہو جائیں گے، اور جو لوگ اس آئیڈیل سے انکا کریں گے وہ خود بخود انسانوں کا ایک دوسرا گروپ ہو جائے گا، خواہ یہ لوگ اس میں بھی مختلف آئیڈیل رکھتے ہوں لیکن خدائی گروپ ان سب سے بہر حال قدرتاً علیحدہ ہوگا۔

انسانوں کی یہ ایک قدرتی تقسیم ہے جو خود ان کے اندر سے پیدا ہوئی ہے، باہر سے نہیں آئی ہے، انسانوں کی روحانی تکیف سے پیدا ہوتی ہے، زبان زمین یا اور کسی مادی اور خارجی شئ سے نہیں ہوتی ہے اور انسانوں کی نسلی و قومی وحدت کے باوجود جس میں تمام چھوٹے بڑے نسلی و قبائلی شعوب شامل ہیں، قدرتاً ان کی دو قومیت بن گئی، ایک اسلامی، ایک غیر اسلامی، لیکن اس تقسیم کے باوجود تمام دنیا کے انسان نہایت خوشگوار پُر امن طریق پر مساوات اخوت انسانی اور ترقیات کے ساتھ دنیا کی مادّی زندگی گذار سکتے ہیں۔ بشرطیکہ قرآن کریم کے کانسٹی ٹیوشن پر

کامل اور مکمل طور پر عمل در آمد ہو۔ اور اس کانسٹی ٹیوشن کے چلانے والے صحیح معنی میں خداترس، متقی، پرہیز گار اور مخلص خادم خلق ہوں۔

انسانی زندگی کے اس کامل دستور حکومت نے تمام غیر مسلموں کو ان کی اختیار کردہ تہذیب و معاشرت میں کامل اختیار دیا ہے کہ جو چاہیں وہ اختیار کریں سوااس کے چوری، ڈاکہ زنی، بداخلاقی و بدکاری جیسے جرائم کی انہیں بھی اجازت نہیں دی گئی ہے کہ یہ تمام چیزیں امن عامہ اور انسانی زندگی کو تباہ کرنے والی ہیں۔

اور مسلمانوں کو ان کی تہذیب اور ان کی مدنیت میں مطلق العنان نہیں چھوڑا گیا ہے بلکہ ان کی تہذیب و مدنیت کے متعلق چند اصول مقرر ہیں جس کے حدود کے اندر ان کو زندگی گذارنی لازم ہے، بس مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد حقیقتاً مذہبی بنیاد پر ہے اور اسی وجہ سے وہ علیحدہ ایک قوم ہیں۔

لیکن میں نہایت افسوس وحسرت کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کو میں بطور نمونہ پیش کردوں جہاں الٰہی دستور کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل در آمد ہو رہا ہو اور انسانوں کی دو قومیں مسلم اور غیر مسلم اس دستور کے ماتحت خوشگوار اور پُر امن زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اس دستور کا چلانے والا صرف نام کا مسلمان نہیں ہو سکتا اس کو ایسا ہی مسلمان بننا پڑے گا جس کی تعریف خود اس کانسٹی ٹیوشن میں موجود ہے،

پس گاندھی جی کو اس پر تو تعجب و حیرت نہیں کرنا چاہئے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں۔

جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کی بنیاد پر یہ ضروری ہے کہ جب کوئی غیر مسلم، مسلم ہو جائے گا تو اس کی انسانی قومیت بدل جائے گی، بلاشبہ اس کی نسلی حیثیت تادم مرگ باقی رہے گی اور وطنی حیثیت بھی رہے گی جب تک وہ اپنے وطن سے منتقل نہ ہو جائے، لیکن اس کی اسلامی قومیت ہمیشہ اور ہر حال میں باقی رہے گی بشرطیکہ وہ مرتد نہ ہو جائے۔

لیکن مسلمانوں کے ایک مستقل قوم ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو مسلمان ہندوستان کے باشندہ ہیں وہ ہندوستانی نہیں وہ بیک وقت اور ہر لمحہ پیدائش سے مرنے تک ہندوستانی بھی ہیں اور مسلمان بھی۔

اسی طرح مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ ہندوستان کے باشندہ مسلمانوں پر اولین فریضہ نہیں ہے کہ وہ ہندوستان کی آزادی اور خوشحالی کی سعی کرے اور یہ بات بھی غلط ہے کہ ہندوستان کی جمہوری حکومت میں اگر مسلمانوں کی تہذیبی خود مختاری تسلیم کر لی جائے اور کانسٹی ٹیوشن میں یہ اختیار حاصل ہو جائے تو مسلمان اس حکومت کو گوارا نہیں کر سکتے۔

گاندھی جی اور دیگر سیاسی لیڈروں کو یقین کر لینا چاہئے کہ مسلمانوں کی

قومیت کا تحفظ، اسمبلی میں کافی نمائندگی سے یا کسی مسلمان کی وزارت اور کافی ملازمتوں سے نہیں ہو سکتا جس کے لئے لیگ کوشاں ہے بلکہ اس کا تحفظ ان اصولوں سے ہوگا جو جمعیۃ علماء ہند پیش کرتی رہی ہے۔

آخر میں یہ چند کلمات اس لئے لکھ دیئے گئے تاکہ ہر فریق اور عامۂ مسلمین اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیں اور کانگریسی لیڈر بھی غور کرلیں کہ ہندو اور مسلمانوں کے فرقہ وارانہ حل کا بنیادی مسئلہ کیا ہے۔

نقیب پھلواری شریف

جلد ۷، شمارہ ۱۹ـ۲۰

۵/ شوال ۱۳۵۸ھ

گاندھی جی اور کانگریس

''گاندھی جی کے فلسفہ کی بنیادیں کیا ہیں؟ کانگریس میں فکری تضاد کی تفصیل اور اس یقین کا اظہار کہ عام کانگریسیوں نے گاندھی جی کے فلسفہ کو بطور عقیدہ نہیں بلکہ وقتی حکمت عملی اور پالیسی کی حیثیت سے قبول کیا ہے۔ اہنسا، ضبط اور سچائی کے جو اصول گاندھی جی نے اختیار کیے ہیں اور جس طرح ان کی تشریح کی ہے، وہ ارتجاعی بن گئے ہیں اور فطرت انسانی کے خلاف ہیں۔ یہ تحریر آج بھی زندہ ہے اور گہرے مطالعہ کی مستحق ہے''۔

(مجاہد الاسلام قاسمی)

ہر وہ شخص جو کم از کم بیس پچیس سال سے ہندوستانی سیاسیات میں عملی حصہ لے رہا ہے اور کانگریس کے ارتقائی منازل کے اسباب و علل پر غور کرتا رہا ہے، وہ ہندوستان کے سربرآوردہ لیڈروں کے محور فکر و عمل سے بخوبی واقف ہے، ان لیڈروں میں گاندھی جی کو ایک ممتاز اور نمایاں فکر و عمل کا مالک سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ان کا فلسفۂ حیات ان چند مخصوص نظریات پر مبنی ہے جن کو انہوں نے، سناتن دھرم، جین، بدھسٹ، ٹالسٹائی اور اسلام کے بعض داعیوں اور پیغمبروں کی تعلیمات سے اخذ کیا ہے اور ان ہی نظریات کے ماتحت انہوں نے اپنی زندگی کا ایک خاکہ تیار کیا ہے۔

یہ ایک طبعی امر ہے کہ جو شخص جن نظریات اور فلسفۂ زندگی کا قائل

ہوتا ہے، اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے خیالات اور زندگی کو اپنے اصول زندگی کے ڈھانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔

اس وجہ سے ہندوستانی سوراج کا جو نقشہ گاندھی جی کے نظریات اور فلسفۂ حیات کے ماتحت ان کے ذہن میں ہے، اس کے تمام خطوط اور رنگ وروپ، ان کی اس مشہور کتاب میں موجود ہیں، جس کا نام "انڈین ہوم رول" ہے جو ۱۹۰۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔ بلاشبہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گاندھی جی سیاست اور کانگریس میں اپنے تمام مفروضہ نظریات کے ماتحت آئے ہیں اور اپنے نظریات کی روشنی میں سیاسی اور معاشرتی تغیرات کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ تمام ہندوستان نہ سہی خود کانگریس نے یا کانگریس کے لیڈروں نے ان نظریات اور فلسفۂ حیات کو ان کے عقیدے کے مطابق کس حد تک قبول کیا اور کیا قدرتی فلسفۂ ارتقاء کے ماتحت یہ امر ممکن بھی ہے کہ گاندھی جی کا ارتجاعی فلسفہ حیات کبھی کامیاب ہو۔

۱۹۲۲ء میں جب کہ سی، آر، داس اور پنڈت موتی لال نہرو وغیرہ نے گیا کانگریس کی تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے سوراج پارٹی قائم کی اور گاندھی اور سوراج پارٹی میں کشمکش شروع ہوئی تو اس کے متعلق جریدۂ امارت پھلواری شریف نے لکھا تھا کہ یہ دونوں پارٹیاں سوراج کے حصول کی مدعی ہیں، لیکن دونوں کے نظریات میں آسمان زمین کا فرق ہے۔

سی، آر داس وغیرہ کے نزدیک سوراج کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں برطانوی اشخاص کو کوئی دخل نہ ہو اور ملک کے تمام سیاسی اور اقتصادی امور کی باگ صرف ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہو۔

اور گاندھی جی کا "سوراج" یہ ہے کہ ہندوستان کا معاشرتی اور معاشی نظام وہ ہو جو آج سے دو ہزار برس پہلے کا تھا، ہر چیز قدیم ہندوستان کی ہو، اگر انگریز کھدر اور گاندھی جی کی وضع و قطع اختیار کر کے حکومت کرنے لگیں تو گاندھی جی کے سوراج کا مفہوم حاصل ہو جائے گا۔

لیکن سی، آر داس اور دیگر لیڈروں کے نزدیک یہ بھی بدترین غلامی ہو گی جس کا انقلاب بھی اسی قدر ضروری ہو گا جس قدر آج کی حکومت کا انقلاب ضروری ہے۔

الغرض گاندھی جی کے سیاسی اور معاشی نظریات اور اصول حیات اول یوم سے کوئی چھپی ڈھکی چیز نہیں ہے، ہر سیاسی مفکر خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، جمعیۃ علماء ہند کے رہنما ہوں، یا مجلس احرار کے سب پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے، لیکن انہیں اس کا بھی یقین ہے کہ گاندھی جی کا نظریہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ہے، کیوں کہ وہ تمام تر ارتجاعی اور غیر فطری ہے۔ چنانچہ جو شخص گاندھی جی کے نظریہ اور فلسفۂ حیات کو کانگریس کے اندر تلاش کرے گا تو اس کو معلوم ہو گا کہ گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کا کہیں نام ونشان تک نہیں ہے،

مثلاً گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کا سنگ بنیاد عقیدۂ عدم تشدد یا اہنسا ہے اور اس کے اس مفہوم کو ذہن میں رکھیئے جو گاندھی جی خود بیان کرتے ہیں کہ قول و فعل یہاں تک کہ دل و دماغ میں بھی تشدد کا تصور کسی کے خلاف نہ ہو۔

اب اس عقیدہ کو دیکھئے کہ تمام کانگریسی تو اس عقیدہ کو کیا قبول کرتے، خود کانگریس کے بڑے بڑے لیڈروں نے (جو گاندھی جی کے فرماں بردار سمجھے جاتے ہیں) بھی قبول نہیں کیا، بلکہ گاندھی جی کی خود عملی زندگی میں کبھی کبھی ایسی باتیں پیش آتی رہتی ہیں جو ان کے عقیدۂ عدم تشدد کے منافی ہوتی ہیں۔

مثلاً انہوں نے احمد آباد آشرم میں ایک گائے کے بچھڑے کو جو بیمار تھا، بالقصد مروادیا، پھر اسی آشرم میں بندروں پر تشدد کرنے کی بھی تدبیریں، ان کے ہی مشورہ سے اختیار کی گئیں تھیں اور کانگریسی وزارتوں کے بعد بمبئی اور کان پور میں ہجوم پر سپاہیوں کے فائرنگ کی مذمت نہیں کی گئی۔

خود کانگریسی نظام کے اندر دیکھئے، تری پورہ اجلاس اور کلکتہ آل انڈیا اجلاس کے موقع پر جو ہنگامہ ہوا کیا اس میں گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کے بنیادی عقیدہ کی پامالی نہ تھی۔

مسٹر سوبھاش کے ساتھ ورکنگ کمیٹی نے جو سلوک کیا اس میں تشدد کے مظاہرہ اور عدم تشدد کی پامالی کی جلوہ گری کے سوا اور کیا چیز ہے، اس سے بحث نہیں کہ یہ فعل درست تھا یا نہیں، بلکہ دیکھنا صرف یہ ہے کہ گاندھی جی کے

عقیدۂ عدم تشدد کی بے بسی خود کانگریسی نظام کے اندر کس قدر نمایاں ہے۔

ابھی ابھی بھولا بھائی ڈیسائی اور شکلا وزیر کے ساتھ رائے پور میں، بوس کے ساتھ پٹنہ میں، کانگریس کے ورکروں اور گاندھی کے پرستاروں نے جو کچھ کیا، وہ سب بھی تو اسی ایک امر کا مظاہرہ ہے کہ گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کے بنیادی عقیدۂ عدم تشدد کو آج تک گاندھی جی کے پرستاروں نے بھی قبول نہیں کیا ہے۔

اسی طرح گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کا اہم جزیہ ہے کہ قومی اور انسانی بھلائی کے لئے ضبط نفس کا اصول اختیار کیا جائے، لوگ ہندوستان کی کامل آزادی تک شادی نہ کریں اور جو لوگ شادی کر چکے ہیں برہم چاری رہیں۔

ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ خود انہوں نے بلاشبہ اس اصول پر عمل کیا، لیکن کانگریس کے کتنے لیڈران نے ان کے اس اصول کو قبول کیا؟ کسی ایک نے بھی نہیں!

ان کے فلسفۂ حیات کا ایک اہم اصول سچائی ہے جو حقیقۃً دین حق کا پیغام ہے، لیکن اس سچائی پر عمل درآمد اور اس عقیدہ پر قائم ہونے کے لئے دین حق نے جو اصول بتائے ہیں، گاندھی جی اس سے شاید خود ناآشنا ہیں اور عموماً پختہ کار کانگریسی بھی، اس لئے کہ کانگریس کے نظام میں سچائی بھی جاری وساری نہیں ہے، جس کی شکایت خود گاندھی جی بارہا کر چکے ہیں، گاندھی جی کے سوا ایک

غیر مسلم کانگریسی بھی کہیں نہیں ہے، جس نے اس طریقہ سے حصول سوراج کا عقیدہ قائم کیا ہو، جو گاندھی جی چاہتے ہیں، بلکہ تقاضائے وقت کے ماتحت ایک حد تک لوگ بطور پالیسی اس کو تسلیم کرتے ہیں اور گاندھی جی اس کو سچائی کے خلاف سمجھتے ہیں، اس کے علاوہ کانگریس کے کاروبار میں بہت سی کارروائیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو اس اصول اور عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ان کے فلسفہ حیات کا ایک اہم اصول لباس و خوراک میں سادگی کا ہے جس کا نمونہ خود ان کی ذات ہے، مگر تمام کانگریس کے لیڈروں اور ورکروں پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ گاندھی جی کے فلسفہ حیات کا یہ اصول یا پروگرام بھی قطعاً ناکام ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ ان کا نظریہ اس باب میں بالکل ارتجاعی اور غیر فطری ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے جائز حدود تک نفع اٹھا کر مہذب وشائستہ زندگی بسر کرنا، انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور یہ فطری جذبہ ہر کس وناکس کے دلوں میں سمندر کی طرح موجیں مار رہا ہے، اس راہ میں جو کچھ رکاوٹ ہے، وہ اقتصادی کمزوری ہے جو برطانوی سامراج کی مرہون منت ہے جس دن یہ رکاوٹ دور ہوئی اور اقتصادی حالتیں کچھ سدھر گئیں، گاندھی جی کی سادگی کے اس تخیل کا کہیں نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا۔

گاندھی جی کے پرستاروں میں سب سے زیادہ اونچا درجہ موجودہ

ورکنگ کمیٹی کے ارکان کے علاوہ ان کا ہے جو کانگریسی حکومتوں میں منصب وزارت پر فائز ہیں۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ جیسے ہی انہوں نے وزارت سنبھالی، ان کی معاشرتی زندگی میں ایک نمایاں انقلاب برپا ہوگیا، وہ انقلاب ارتجاعی نہیں ہے، گاندھی جی کی طرح نیم برہنگی نہیں ہے، بلکہ ارتقائی ہے اور نسبۃً دیدہ زیب اور آرام دہ لباس و پُر تکلف رہائش ہے، کیا گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کی ناکامی پر بین دلیل نہیں ہے۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ گاندھی جی کو بھی ان کے ضمیر کی آواز یہ سنائی دینے لگی ہے کہ کانگریس کے حلقہ میں ان کے عقیدہ کے منشاء کے مطابق عدم تشدد اور سچائی کو کوئی دخل نہیں ہے، اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ کانگریس کے کریڈ سے لفظ جائز اور پُر امن کا قید نکال دی جائے اور ممبری کے لئے کھدر کے استعمال کی شرط کو بھی ہٹا دیا جائے، جیسا کہ ابھی حال میں خود انہوں نے اعلان کیا ہے، مگر دیگر رہنمایان کانگریس اس قید کے اٹھانے پر متفق نہیں ہیں، کیوں کہ انہوں نے تو ان قیود کو بحیثیت پالیسی اختیار کیا ہے نہ کہ مذہبی عقیدہ کے طور پر۔

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ گاندھی جی کا نظریۂ حیات اور فلسفۂ زندگی آج تک کانگریس کے نظام میں کس درجہ غیر مقبول ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ گاندھی جی کا ''مہاتما پن'' کانگریس کو ہندو عوام میں مقبول بنانے میں بہت مؤثر ثابت ہوا اور ان کی عزیمت اور مسلسل جدّ و جہد سے ہندوستان میں

ایک عام سیاسی شعور و احساس پیدا ہو گیا۔ برطانوی سامراج کی تمام مخالف قوتیں بیدار ہو گئیں۔ جن میں وقتی حوادث نے بھی بہت کچھ طاقت بخشی اور اس ماحول نے گاندھی جی کی شخصیت کو وہ منصب عطا کیا جس پر آج وہ فائز ہیں۔

لیکن جس دن گاندھی جی برطانوی سامراج سے رشتہ محبت جوڑیں گے یا برطانوی سامراج کی مقاومت سے علیحدہ ہوں گے، ان کو کانگریس اور کانگریسی نظام سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔

چنانچہ دنیا دیکھ رہی ہے کہ جب کانگریس کے بعض لیڈروں کو گاندھی جی کے کسی طرز عمل سے یہ شبہ پیدا ہوا کہ وہ برطانوی سامراج سے فیڈریشن کے معاملہ میں سمجھوتہ کی طرف مائل ہیں تو وہ ان کے اس فعل کے خلاف آواز بلند کرنے پر مجبور ہو گئے اور آج کانگریس کے نظام کے اندر ایک فارورڈ بلاک قائم ہو رہا ہے، کانگریس کی ارتقائی تاریخ بتاتی ہے کہ اگر گاندھی جی نے برطانوی سامراج سے جنگ کی طرف قدم نہیں بڑھایا تو کانگریس سے وہ بہت پیچھے رہ جائیں گے اور ان کا حشر بھی وہی ہو گا جو ۱۹۲۰ء کے ان کے پیش روبے تاج کے بادشاہ کا ہوا۔

لیکن گاندھی جی نہایت ذہین اور زبردست غور و فکر کے مالک ہیں اور عملی آدمی ہیں، عواقب و نتائج پر ان کی نگاہ ہے، انہیں معلوم ہے کہ کانگریس ایک سیاسی جماعت ہے، جس میں مختلف مذاہب کے لوگ شامل ہیں۔ مسلمان،

عیسائی، سکھ، پارسی کے نزدیک ان کے مخصوص مذہبی عقیدہ کی کوئی اہمیت ہو ہی نہیں سکتی، صرف ہندوؤں سے وہ امید رکھ سکتے ہیں کہ شاید وہ اکثریت کے ساتھ ان کے عقیدہ اور فلسفہ کو قبول کریں گے، لیکن دس سال کے تجربہ کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ کانگریس کے وسیع میدان میں ان کے عقیدہ اور فلسفۂ حیات کو قدم جمانے کی گنجائش نہیں ہے۔

اس لئے انہوں نے ایک دوسری زمین بنائی ہے جس کا نام گاندھی سیوا سنگھ ہے۔ گاندھی جی نے اپنے مخصوص نظریۂ حیات کے ماتحت یہ جماعت بنائی ہے جو ان کے فلسفۂ زندگی کی اعتقاداً و عملاً حامل ہو گی اور اسی گروہ میں گاندھی جی اپنے فلسفۂ حیات کی روحانیت کا مشاہدہ کر کے راجا رام موہن رائے، گرونانک، دیانند سرسوتی کی طرح گاندھی مت کے پرستاروں کا ایک گروہ ہندوستان میں بنادیں گے۔

اور اسی مقصد کے پیش نظر وہ ہریجن کے سیوا میں بھی لگے ہوئے ہیں۔ الغرض انہوں نے مذہب اور فلسفۂ حیات کا مرکز عمل ہریجن اور گاندھی سیوا سنگھ کو بنالیا ہے اور ان کا مقصد حیات اسی سے وابستہ ہے۔

لیکن کانگریس ملک کی بہت بڑی طاقتور جماعت ہے وہ اس کو بھی کلیۃً چھوڑنا نہیں چاہتے، آخر کچھ ہندو گاندھی مت کے ماننے والے کانگریس میں بھی موجود ہیں، اور رہیں گے، نیز ان کی کانگریس کی قابل قدر خدمات کا کچھ نہ کچھ

دوسروں پر اثر ہے۔ اس لئے کانگریس کے حلقہ میں بھی اپنے مقصد کے لئے کچھ کام کر سکتے ہیں۔

لیکن کانگریسی لیڈروں پر گاندھی جی کے اثر ورسوخ کو دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا کہ کانگریس اب صرف سیاسی جماعت نہیں ہے بلکہ مذہبی بھی ہے اور وہ گاندھی مذہب کا حامل ہے اور گاندھی جی کی روحانیت کانگریس پر مسلط ہو رہی ہے، جیسا کہ کرپلانی صاحب کا خیال ہے تو وہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے اور اس کا غلط ہونا ان واقعات کی روشنی میں جس کی طرف اوپر کے سطور میں اشارات کئے گئے ہیں بالکل واضح ہے۔ کانگریس کی تجاویز اور ہر کانگریسی لیڈر کے اندرونی وبیرونی زندگی کا جائزہ لے کر ہر شخص یقین کر سکتا ہے کہ کرپلانی صاحب نے جو کہا ہے اس میں کوئی اصلیت نہیں ہے۔

لیکن بلاشبہ یہ سوال ہوتا ہے کہ کرپلانی صاحب نے ایسے وقت میں جب کہ کانگریس کے اندر باہمی کشمکش جاری ہے اس قسم کا بیان کیوں دیا، کیوں کہ ان کے اس بیان سے ہندوؤں کے علاوہ بہت سے دیگر مذہب والوں کو تو کانگریس سے نفرت پیدا ہونے کا امکان ہے۔ کیا کرپلانی صاحب کانگریس کے دشمن ہیں کہ اس کو وہ برباد کرنا چاہتے ہیں؟

تو اس کا جواب صاف ہے کہ کرپلانی صاحب اس وقت گاندھی گروپ یا دائیں بازو میں شامل ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ یہ گروپ کانگریس پر آئندہ بھی

قابض رہے اور قبضہ اسی وقت رہ سکتا ہے جب کہ ملک کے عوام باشندے اس گروپ کے ساتھ ہوں، لیکن بوس اور ان کی جماعت اب عوام کو اس گروپ کے خلاف ابھار رہی ہے جس سے اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ آئندہ اس گروپ کا کانگریس پر اقتدار نہ رہے۔ اس لئے اس اقتدار کو باقی رکھنے کے لئے موجودہ وقت میں گاندھی کی شخصیت اور ان کے مہاتما پن کا پرچار سب سے بڑا حربہ ہے، جن سے بائیں بازو کو مجروح کیا جا سکتا ہے۔

عوام ہندو گاندھی جی کے مہاتما پن پر فدا ہیں اور ان کے اسی نام و صفت پر اپنا تن من دھن سب کچھ ایک حد تک قربان کرنے کو تیار ہیں، اور اس قوم کے قومی مزاج کا بھی خاصہ ہے۔ وہ فلسفۂ حیات اور اصول زندگی کی باریکیوں کو نہیں سمجھتے ہیں، صرف مہاتما پن کی صورت اور ان کی پکار کو دیکھتے ہیں، لیکن متوسط طبقہ کے لوگ جو کچھ پڑھے لکھے ہیں وہ علمی اصطلاحوں سے بھی کچھ مرعوب ہوتے ہیں، انہیں کو مرعوب کرنے کے لئے گاندھی جی کے اہنسا، ستیہ اور فلسفۂ زندگی، عقیدہ اور پروگرام کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو ہندو سوسائٹی میں لفظاً مقبول ہیں تاکہ عوام کے علاوہ متوسط پڑھا لکھا ہندو بھی گاندھی گروپ کی حمایت پر ہر وقت کمربستہ رہے، گویا کرپلانی صاحب ہندو کانگریس مینوں (CONGRESS MEN) کو ڈرانا چاہتے ہیں کہ اگر تم نے بوس کی حمایت کی ہے تو کانگریس کے ذریعہ اہنسا دھرم کی پامالی ہوگی، گاندھی جی کا مہاتما پن خاک میں

مل جائے گا۔

الغرض کرپلانی صاحب کا مقصد یہ ہے کہ کانگریس کے آئندہ انتخابات میں بوس کی پارٹی کو کانگریس میں گھسنے کا موقع نہ دیا جائے ورنہ یہ گاندھی گروپ ہی کی شکست نہ ہوگی بلکہ گاندھی جی کی شکست ہوگی جسے کسی ہندو کو برداشت نہ کرنا چاہیے، چاہے وہ گاندھی جی کے خود ساختہ مذہب اور فلسفہ کو تسلیم کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ ہندو قوم کے مزاج سے کرپلانی صاحب خوب واقف ہیں، اس لئے انہوں نے ایک نہایت موثر حربہ اس بیان کے ذریعہ بوس کے خلاف استعمال کیا ہے۔اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی، گاندھی جی کو نہ کل مہاتما مانتے تھے نہ آج مانتے ہیں، وہ کانگریس میں محض اس لئے شریک ہوئے ہیں کہ وہ برطانوی شہنشاہیت کے خلاف متحدہ محاذ ہے۔ جب تک یہ محاذ رہے گا وہ شریک رہیں گے ان کے نزدیک گاندھی جی کے عقیدہ اور فلسفۂ زندگی کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ پھر بھی محض سیاسی نقطۂ نگاہ سے گاندھی جی کی وقعت ان کی نگاہ میں ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ گاندھی جی کی شخصیت اور قوت عمل سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اسی قسم کے خیال رکھنے والے مسلمان سکھ وغیرہ کانگریس میں شریک ہیں وہ کرپلانی صاحب کے اس بیان کو حقائق سے دور سمجھتے ہوئے یہ یقین کریں گے کہ کرپلانی کا یہ بیان اس زمانہ میں کس مقصد سے دیا گیا ہے۔

ہاں جو لوگ کانگریس سے باہر ہیں یا جو ۳۷ء سے کانگریس میں آئے ہیں جن کو گذشتہ واقعات اور موجودہ حالات کی صحیح اطلاع نہیں ہے، وہ بلاشبہ چیں بجبیں ہو سکتے ہیں مگر ان کے چیں بجبین ہونے سے اس مقصد کو نقصان نہ پہونچے گا جس کے لئے یہ بیان جاری کیا گیا ہے۔

بہر حال کرپلانی صاحب کا بیان اگرچہ بہت غلط اور سراسر بے بنیاد ہے اور ناواقفوں کے لئے گمراہ کن بھی ہے لیکن گاندھی گروپ کے اقتدار کے تحفظ کے لئے شاید وقت کے تقاضا سے اس کی ضرورت بھی تھی۔

اب رہا یہ سوال کہ گاندھی جی کا فلسفہ زندگی یا ان کے خود ساختہ مذہب کی اہمیت کے ازالہ کیلئے علماء کرام اور جمعیۃ علماء کیا کر رہی ہے۔ شاید مسلم لیگ کے زہر کے مارے ہوئے لوگوں کو علماء ملت اور جمعیۃ علماء ہند کے ارکان کے وہ کارنامے نظر نہیں آتے جو تمام کفریات اور فسق وفجور کے زہر کا تریاق کامل ہے، اگر گاندھی جی کانگریس سے مایوس ہو کر گاندھیت کی اشاعت کیلئے ہریجن سیوا دل، اور گاندھی سیوا سنگھ کو چلا رہے ہیں، جس طرح دیانندی مت کی اشاعت کے لئے گروکل کھولے گئے ہیں تو علماء ملت نے دار العلوم دیوبند وندوۃ العلماء جیسی یونیورسٹیاں قائم کی ہیں اور صرف ہر صوبہ میں نہیں بلکہ اکثر اضلاع اور گاؤں تک میں قرآن وحدیث اور دین اسلام کی تعلیم کے لئے مدرسے کھول دیئے ہیں اور ان مدرسوں کا سلسلہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیلا ہوا ہے جس میں کم وبیش ربع لاکھ اسلام کے فرزند اسلامی اسلحہ سے مسلح کئے جاتے ہیں اور ان ہی

مدارس کے بہادر سپاہی ایک طرف ملک کو غیروں کی غلامی سے آزاد کرانے کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہیں تو دوسری طرف تمام کفریات اور فسق وفجور کی بنیادوں کو اکھاڑنا چاہتے ہیں اور تیسری طرف اسلامی زبان (عربی) اسلامی کلچر اور اردو زبان کے محافظ وداعی ہیں۔ پھر ان مدارس کے علاوہ خانقاہیں ہیں جہاں تزکیہ باطن کے علاوہ دعوت جہاد وحریت بھی دی جاتی ہے۔ اور جہاں کے لوگوں کی زبان اردو ہے، لباس اور رہائش خالص اسلامی ہے ان کی صورت وسیرت نہ ہندوؤں سے ملتی ہے نہ فرنگیوں سے انہی حق پسند اداروں کے ذمہ دار اور ارکان نے ایک اجتماعی شکل اختیار کرلی ہے جس کا نام جمعیۃ علماء ہند ہے۔

اب وہ مسلمانوں کی جماعتی اسلامی اور سیاسی تحفظ کے لئے امارت شرعیہ کا نظام تمام ملک میں جاری کرنا چاہتی ہے، کیوں کہ مستقبل میں مسلمانوں کی اسلامی زندگی کی بقا اسی نظام سے وابستہ ہے۔

اگر مولانا حسین احمد ایک طرف جمعیۃ علماء کے رہنما اور کانگریس کے ممبر ہیں تو دوسری طرف دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم الشان عربی خالص اسلامی یونیورسٹی کو اپنی خداداد قابلیت سے چلا رہے ہیں۔

علامہ مفتی کفایت اللہ اگر ایک طرف جمعیۃ علماء ہند کے صدر ہیں اور کانگریس کے شرکت کے حامی ہیں تو دوسری طرف مدرسہ امینیہ دہلی جیسی عظیم الشان اسلامی درسگاہ کو بھی پروان چڑھا رہے ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی اگر جمعیۃ علماء کے رکن ہیں اور وطنی انجمن کی شرکت کے داعی تو وہ دار العلوم ندوۃ العلماء اور دار المصنفین جیسے مفید ادارہ کے روح رواں ہیں، جہاں سے اسلامی تعلیمات، اسلامی تاریخ، اسلامی تمدن ومعاشرت کی جلوہ ریزی شب و روز ہوتی رہتی ہے، اور اردو زبان کی خدمت صرف سید سلیمان ندوی کی زبان و قلم نے اس قدر کی ہے جس کا اندازہ بہت مشکل ہے۔

اسی طرح مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا عتیق الرحمٰن وغیرہم معزز ارکان جمعیۃ علماء ہند اگر جمعیت علماء کی خدمت کے ساتھ ساتھ کانگریس میں شامل ہیں تو دوسری طرف وہ ندوۃ المصنفین دہلی کے بھی روح رواں ہیں جہاں سے سیاسیات، اقتصادیات اور دیگر اہم نظریات پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اردو زبان میں کتب ورسائل شائع ہو رہے ہیں۔

اسی طرح اور بہت سے ارکان جمعیۃ علماء اسلام اور مسلمان کے بقاو تحفظ اور مستقبل کے لئے علمی و عملی کام کر رہے ہیں۔

ان واقعات اور حقائق کی روشنی میں گاندھی ازم" "ہندو ازم"، جناح ازم، کے اثرات سے مسلمانوں کو مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں، اگر مسلمان ان بُرائیوں سے بچنا چاہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ اس مشن کو ہر طرح تقویت پہونچائیں جو جمعیۃ علماء کے پیش نظر ہے اور ان اداروں کو مضبوط کریں جن کو علماء اسلام چلا رہے ہیں۔

فرقہ وارانہ معاملات کا فیصلہ

کن اصولوں پر ہونا چاہئے

میری توجہ ان بیانات اور اپیلوں کی طرف مبذول کرائی گئی ہے جو ملک کے ذمہ دار حضرات کی جناب سے "تحریک تبراء" اور "شیعہ و سنّی مفاہمت" کے متعلق اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں، میں نے ان بیانات کو غور سے پڑھا لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں مفاہمت و مصالحت کے بنیادی اصولوں کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے اصل موضوع کی تشنگی اسی طرح باقی رہ جاتی ہے، ان حالات میں غور و فکر کے لئے چند اصولی باتیں عرض کر دینا چاہتا ہوں جن کا لحاظ ہر مصالحت و مفاہمت میں ضروری ہے۔

ا۔ یہ ملک ایسی مختلف قوموں سے آباد ہے جس کے مذہبی عقائد اور مسلک کا اختلاف انتہا کو پہونچا ہوا ہے، ہر ایک فرقہ کے بہت سے اصولی عقائد ایسے ہیں جن کا اظہار دوسروں کے لئے حد درجہ تکلیف دہ ہے، مثلاً عقیدہ بت پرستی ہے جس کا تخیل بھی موحدین کے لئے ناقابل برداشت ہے، تعزیہ داری ہے جو اہل سنت کے لئے تکلیف دہ، گاؤ خوری ہے، جن سے گاؤ پرست تکلیف محسوس کرتے ہیں اور گاؤ پرستی موحدین کے لئے دل آزار ہے اور جب

صورت حال یہ ہے تو اس ملک کے رہنماؤں اور ارباب حکومت کو مصالحت یا کسی موقع پر ''مذہبی آزادی'' کے حدود کو اس طرح متعین کرنا چاہئے کہ کسی فرقہ اور گروہ کے ساتھ ناانصافی نہ ہو اور تمام فرقہ کے مذہبی اور شہری حقوق میں یکسانیت نظر آئے۔

۲۔ اب سوچنا یہ ہے کہ مذہبی آزادی کے حدود کیا ہیں جن کی پابندی سے حتی الامکان تمام فرقوں کے ساتھ بڑے حد تک منصفانہ سلوک ممکن ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں اہل اسلام اور تمام عقلاء دہر متفق ہیں کہ ہر فرقہ و گروہ کو اپنے عقیدہ کے اظہار اور اس پر عمل کی آزادی دو شرطوں سے مشروط ہے۔

اول یہ کہ عقیدہ ایسا نہ ہو جس کا پبلک مقامات میں اعلان، اظہار اور عمل سے انسانی تہذیب و شائستگی کو نقصان پہونچے۔

دوسرے یہ کہ اس عقیدہ و عمل کا اعلان یا طریق اظہار دوسروں کے لئے اشتعال انگیز نہ ہو، ان ہی دو شرطوں کے ساتھ مذہبی و شہری حقوق کی آزادی ہر فریق کو ہونی چاہئے اور جس فرقہ کے عقیدہ و عمل کا اظہار و اعلان مذکورہ بالا حدود کو توڑتا ہو، ان کو آزادی نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً ہندوستان میں ایک گروہ ایسا موجود ہے جو مادر زاد برہنگی کے ساتھ سڑکوں پر چلنا پھرنا، مندروں اور دریا کے گھاٹوں پر جانا اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہے مگر چوں کہ اس عقیدہ پر عمل کرنا

انسانی تہذیب کے خلاف اور حد درجہ حیا سوز ہے، اس لئے اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اسی طرح کسی فرقہ کے پیشواؤں کو علانیہ سب و شتم کرنا یا ان کے خلاف علانیہ دل آزار باتیں کہنا انسانیت کے منافی ہے اور حد درجہ اشتعال انگیز ہے، اس لئے اس عقیدہ کے مطابق عمل کی آزادی نہیں دی جا سکتی۔

یا مثلاً گائے ذبح کرنا مسلمانوں کا اور ہر اس شخص کا جو گائے کا گوشت کھاتا ہے، ایک حق ہے جس کی انہیں پوری آزادی ہونی چاہئے، لیکن پردہ کے ساتھ اور اپنے گھروں میں۔ کیوں کہ اس طرح پر عمل کرنے سے نہ کسی کی دل آزاری ہو سکتی ہے اور نہ کسی کے مشتعل ہونے کی کوئی وجہ، ہاں اگر کوئی شخص مندر کے سامنے یا پبلک مقامات پر علانیہ گائے ذبح کرنا چاہے گا تو آزادی کے حدود کو توڑے گا کیوں کہ اس میں دوسروں کی دل آزاری اور اشتعال کا خطرہ ہے، اسی طرح ہندوؤں کو اپنے مذہبی پیشواؤں اور بتوں کے جلوس نکالنے کی اجازت اسی وقت مل سکتی ہے جب یہ جلوس کسی پبلک جگہ پر کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے عام پبلک یا مسلمانوں کو اشتعال پیدا ہو اور یہ جلوس ایسی چیزوں پر مشتمل نہ ہو جو منافی اخلاق ہوں۔

غرض کہ فرقوں اور قوموں کے مذہبی اور شہری حقوق کا فیصلہ یا باہمی مصالحت و مفاہمت متذکرۂ صدر ان ہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہونا چاہئے تاکہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہ ہو اور اگر تبرائیوں کی تحریک سے متأثر ہو کر یا مسلمانوں کے "اتحاد" کے تصور سے رہنمایان ملک یا محض حکومت نے

کوئی دوسرا طریقہ کار اختیار کیا تو اس سے ملک میں کبھی امن نہیں ہو سکتا اس لئے حکومت کے ذمہ دار وزراء اور مسلمانوں کے رہبروں کو اس معاملہ میں سنجیدگی سے غور کر کے کوئی منصفانہ اور مساویانہ فیصلہ کرنا چاہئے، اور اگر حکومت اور اہل ملک متذکرہ صدر مساویانہ اور منصفانہ اصول پر عمل کرنے کو تیار نہیں ہیں، تو پھر دوسرا طریقہ کار وہ ہے جو مئی کے پہلے ہفتہ میں اخبارات کے ذریعہ اہل ملک اور حکومت کے سامنے پیش کر چکا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تمام فرقوں اور قوموں کے مذہبی جلسے اور جلوس پبلک مقامات پر بند کر دیئے جائیں خواہ شیعہ، سنی کا مذہبی جلسہ جلوس ہو یا ہندوؤں کے کسی فرقہ کا"۔ اگرچہ یہ طریقہ مطلقاً غیر محمود ہے، لیکن تمام قوموں کے لئے مساویانہ ہوگا جس سے کسی کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہونی چاہئے اور اس طریقہ سے آئے دن کے بہت سے فرقہ وارانہ فساد کی جڑ کٹ جائے گی۔

نقیب پھلواری شریف

جلد نمبر ۷، شمارہ نمبر ۹

۵؍ جمادی الاولی ۱۳۵۸ھ

مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کی اسکیم پر

ایک اہم تبصرہ

(حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اہم مضمون ہم شائع کر رہے ہیں۔ قارئین کرام اس کا غور و فکر سے مطالعہ کریں اور سوچیں کہ زعماء لیگ نے مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا یا پاکستان بنانے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ مسلم مقاصد کے لئے مفید ثابت ہوگا، یا یہ محض دوسروں کی بد شگونی کے لئے اپنی ناک کٹانے کے مرادف اور ہندوستان کی مدت غلامی کی توسیع کا سبب ہوگا)۔

مسلم لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں دو ڈھائی سال کے غور و فکر کے بعد ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسائل کا آخری حل اپنے نقطہ نگاہ سے پیش کر دیا، اور جس کے متعلق مسٹر جناح صاحب کا اعلان ہے کہ اب وہی ان کی لیگ کا نصب العین ہے۔ اور ہندو مسلم اختلافات کا صرف یہی ایک حل ہے۔

میں ابھی مسٹر جناح کے اس نصب العین اور تجویز کے متعلق تنقید اور اظہار خیال کو غیر ضروری سمجھتا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ مسٹر جناح اس نصب العین کی پوری تفصیلی اسکیم حسب ہدایت مسلم لیگ جب شائع کر دیں تو اس وقت اس اسکیم پر تنقید اور جرح اور اس کے نفع و نقصان کے ظاہر کرنے کا بہترین موقع ہوگا۔ لیکن جب

اس اسکیم پر ہر چہار طرف سے جرح و تنقیدیں شروع ہو گئیں تو مجھ سے بھی مسلم احباب نے اظہار خیال کی باصرار خواہش کی کہ لیگ کی مجوزہ نصب العین یا اسکیم کے متعلق میں اپنی رائے ظاہر کروں تاکہ ہندو اور مسلمانوں میں غور و فکر کرنے والے اصحاب کے سامنے میرا نقطہ نگاہ بھی سامنے آجائے۔

لاہور سے پہلے :

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ دوڈھائی سال سے کانگریس اور ہندو اکثریت کی اصلی، یا فرضی مظالم پر صرف ماتم کر رہی ہے اور اس کے علاج کی کوئی تجویز آج تک پیش نہیں کر سکی تھی۔ حالانکہ ان سے کانگریسی لیڈروں نے بار بار پوچھا کہ آخر لیگ چاہتی کیا ہے۔ یوپی۔ بہار، سی پی میں جو شکایتیں مسلم لیگ کو تھیں اگر اس کو کلیۃً صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو ان صوبوں کے مسلمانوں کی فرحت بخش زندگی کے لئے کن اصولوں کے وضع و اختیار کو پسند کرتی ہے، مگر لیگ کوئی ایک بات مسلم اقلیت والے صوبوں یا یوں کہئے کہ ہندو اکثریت والے صوبوں کی بابت لاہور اجلاس تک نہیں بتا سکی۔

میں بہت خوش ہوں اور مسٹر جناح کا شکر گزار ہوں کہ لیگ نے اپنے اجلاس میں دوڈھائی سال کے سوچ بچار کے بعد ایک بات تو کہہ دی جو مسٹر جناح کے خیال کے مطابق ایک آخری حل ہے۔

لاہور کے بعد :

اب مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو خصوصیت سے غور و فکر کا موقع مل گیا ہے کہ وہ لیگ کی مجوزہ اسکیم پر مسٹر جناح اور لیگ کے دیگر لیڈروں کے توضیحی بیانات کی روشنی میں غور کریں کہ دو ڈھائی سال سے جن امور پر ماتم کیا جارہا تھا، کیا اس اسکیم میں اس کے انسداد و اصلاح کا کوئی امکان بھی موجود ہے۔

ہر معمولی سمجھ کا انسان لیگ کی مجوزہ اسکیم اور مسٹر جناح کے توضیحی اعلان کو سامنے رکھ کر صاف طور سے دیکھ سکتا ہے کہ اس اسکیم میں ہندو اکثریت والے صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے مزید تسکین کا کوئی ایسا ذریعہ تجویز نہیں کیا گیا ہے جو ان کے لئے قابل اطمینان ہو۔

اسکیم کا تعلق :

بلکہ مسلم لیگ کی اسکیم کو جو کچھ تعلق ہے وہ مسلم اکثریت کے صوبوں سے ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ مسلم لیگ نے گزشتہ دو ڈھائی سال کے عرصہ میں ان صوبوں کے مسلمانوں کے متعلق کوئی شکایت بھی نہیں کی۔ گویا موجودہ ناقص جمہوری دستور حکومت اور ناقص صوبہ جاتی خود مختاری اور مرکزی وحدانی حکومت کے ماتحت بھی مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوگی۔ کیونکہ مسلم لیگ کے نزدیک پنجاب، بنگال، سندھ و صوبہ سرحد کے مسلمان

بھی موجودہ ناقص دستور حکومت کے عمل در آمد میں کچھ بھی مظلوم ہوتے تو لیگ واحد نمائندگی کی بنا پر کچھ نہ کچھ ضرور شکایت کرتی مگر عدم شکایت کے باوجود مسٹر جناح جو اسکیم تجویز کرتے ہیں اس کا مفاد یہ بتاتے ہیں کہ مسلم اکثریت کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے، مگر یہ نہیں فرماتے کہ اس اسکیم کے ماتحت برطانیہ کی غلامی سے بھی آزاد ہوں گے۔

مسلم اقلیت کے حقوق کی ضمانت:

باقی رہے مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمان جن کو وہ صرف دو کروڑ فرماتے ہیں (حالانکہ وہ تقریباً نو کروڑ ہیں۔ ان کو ہندو اکثریت کی غلامی پر رضامند ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور اس کی تسکین کے لئے زیادہ سے زیادہ جو بات کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلم اکثریت والے صوبوں کی مجموعی طاقت اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی حفاظت کی ضمانت ہو گی۔

ضمانت کے دو فرضی نظریے:

اور اس ضمانت کی عملی شکل صرف دو نظریئے پر مبنی ہے: اول یہ کہ مسلم اقلیت پر جب ہندو اکثریت ظلم کرے گی تو مسلم اکثریت والے صوبوں میں وہاں کے ہندوؤں سے ان کا بدلہ لینا ممکن ہو گا۔ اور اسی بدلہ کے خوف سے ہندو اکثریت مسلم

اقلیت پر ظلم نہیں کرے گی۔

مگر یہ نظریہ محض خیالی اور وہمی ہے جن کا وجود کبھی نہیں ہوگا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی حکومت اپنی پر امن اور وفادار رعایا پر محض اس لئے ظلم نہیں کر سکتی ہے کہ دوسری حکومت میں اس کے ہم مذہبوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ اس دنیا کے موجودہ عہد میں ایسا خیال صرف کوئی احمق و مجنوں ہی کر سکتا ہے۔

نظریہ اول کی بے مائیگی :

دنیا جانتی ہے کہ ترکوں نے ترکی عیسائیوں پر آج تک محض اس لئے کبھی ظلم نہیں کیا کہ برطانوی حکومت یا دوسری عیسائی حکومتیں اپنی حکومت میں مسلمانوں پر ظلم کرتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی احکام کی رو سے مسلم حکمراں مجبور ہیں کہ اپنے محکوم غیر مسلموں سے ہمیشہ بہتر سلوک کریں۔ جب تک وہ وفادار رہیں، اور شرعاً یہ امر کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو تو وہ اس کا انتقام اپنی ان محکوم اور ان وفادار غیر مسلموں سے لیں جو مسلمانوں پر ظلم کرنے میں کسی طرح شریک نہیں تھے۔ دوسرا فرضی نظریہ یہ ہے کہ مسلم اکثریت والے اپنی مجموعی طاقت سے ہندو اکثریت والے صوبوں پر یلغار کر دیں گے اگر ان صوبوں کے مسلمانوں پر ظلم ہوگا، یا ان کے مجوزہ مفاد کو کوئی نقصان پہنچے گا، اور اس فرضی حملہ کے خوف سے مسلم اقلیت کی حفاظت ہو جائے گی۔

میں یقین اور بصیرت کے ساتھ کہتا ہوں اس دنیا کے موجودہ ماحول میں یہ فرضی نظریہ بھی کبھی عملی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ کیا مسلمانان ہند ناواقف ہیں کہ ۵۷ء سے لے کر اس وقت تک مسلمانان ہند پر کیا کیا مصیبتیں نازل نہیں ہوئیں، مگر مسلمانوں کی آزاد طاقتور حکومتوں، خاص کر خلافت اسلامی نے اس ظلم سے بچانے کے لئے کبھی ہندوستان پر حملہ نہیں کیا۔ حملہ تو بڑی چیز ہے، کبھی انہوں نے اس کے متعلق کوئی نوٹس بھی نہیں دی۔ دور کیوں جایئے ابھی ابھی کے تازہ واقعات ہیں البانیہ کی اسلامی ریاست پر جابرانہ قبضہ کر لیا گیا مگر تمام آزاد اور نیم آزاد اسلامی حکومتیں تماشہ دیکھتی رہیں۔ کسی نے کوئی حرکت نہیں کی۔ مسلمانان فلسطین نے اپنی داستان غم تمام دنیا کے مسلمانوں کو بابار سنائی۔ اسلامی حکومتوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کیا۔ جہاد بالسیف کے لئے اعلان کیا۔ مگر دنیا جانتی ہے کہ لفظی ہمدردی جس طرح ہندوستان کے محکوم مسلمان کرتے رہتے ہیں، اسی طرح آزاد مسلم حکمرانوں نے بھی کی، اور اس سے زیادہ کسی نے کچھ نہیں کیا۔

کیا ان واقعات کے بعد بھی کسی شخص کو یہ وہم ہو سکتا ہے کہ اس فرضی نظریہ کا کبھی وجود بھی ہوگا۔

مسلم اسٹیٹ کے اجزاء ترکیبی اور اس کی طاقت:

اس کے علاوہ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھا جائے کہ مسٹر جناح کی اسکیم

کے ماتحت ان کے مفروضہ مسلم اسٹیٹ کے باشندے صرف مسلم ہی نہیں ہوں گے ، بلکہ غیر مسلم بھی ہوں گے جیسا کہ مسٹر جناح نے اپنے بیان میں خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ غیر مسلم باشندے بھی حکومت کے شریک کار ہوں گے، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس قسم کا مشترک اسٹیٹ جس کو مسٹر جناح غلط طور پر مسلم ریاست کہہ رہے ہیں۔ دوسرے مشترک اسٹیٹ پر جس کو مسٹر جناح ہندو اسٹیٹ کہتے ہیں حملہ کردے یا اپنے ہی اسٹیٹ کے اندر بے قصور ہندوؤں سے کوئی انتقام لے۔ الغرض اس قسم کے وہمی تصورات اس دنیا میں مجنوں یا بد ترین احمق کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر جناح ان حقائق سے ناواقف نہیں ہیں اور وہ یقین کرتے ہیں کہ ان کی مجوزہ اسکیم کے ماتحت بھی اگر وہ بروئے کار آئے تو بھی ہندو اکثریت والے صوبوں میں مسلم اقلیت کے حقوق و مفاد کی حفاظت کی کوئی ضمانت بعض مسلم ریاستوں کے قیام سے نہیں ہو سکتی ہے۔

مسلم اقلیت کے حقوق سے دست برداری :

اسی لئے وہ اعلان کرتے ہیں کہ مسلم اقلیت والے صوبوں کے دو کروڑ مسلمانوں کو مسلم اکثریت والے صوبوں کے چھ کروڑ مسلمانوں کی آزادی میں رکاوٹ پیدا نہیں کرنی چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ دو

کروڑ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی غلامی پر قناعت کر کے چھ کروڑ مسلمانوں کو ان کے مفروضہ اسٹیٹ کے قیام کا موقع دینا چاہیے۔ چاہے ان دو کروڑ مسلمانوں کو اپنے مذہب، تمدن، معاشرت، جان و مال کو خواہ کسی قدر خطرات پیش آئیں۔ خواہ وہ تباہ ہو جائیں مگر چونکہ چھ کروڑ مسلمانوں کی تعداد دو کروڑ کی تعداد سے زیادہ ہے۔ اس لئے مسلم اقلیت کی مذہبی، جانی، مالی قربانی مسلم اکثریت کے لئے عقلاً و شرعاً جائز ہے۔

مسٹر جناح سے ایک سوال :

بلاشبہ یہ نظریہ اور دلیل صحیح ہے، مگر کیا اس صورت میں یہ دو کروڑ مسلمان، مسٹر جناح اور ان کے ہم خیالوں سے یہ پوچھنے کا حق نہیں رکھتے ہیں کہ جب یہی بات ٹھہری تو آخر دو ڈھائی سال تک ہم دو کروڑ مسلمانوں کی مظلومیت کا کیوں ماتم کیا گیا۔ اور کیوں ہم غریبوں کے لاکھوں روپئے جلسوں اور جلوسوں پر برباد کئے گئے۔

لیگ کی جدید اسکیم کی تاریخ :

کیوں کہ ان کی یہ اختیار کردہ اسکیم کچھ آج کی پیداوار نہیں ہے۔ سب سے پہلے ۲۲ء میں جبکہ کانگریس، جمعیۃ العلماء، خلافت کانفرنس کے اجلاس، گیا میں ہو رہے تھے۔ بیرون ہند سے یہ اسکیم آئی تھی جس کو خود مسلمان لیڈروں نے ناقابل

التفات سمجھا، پھر ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس اسکیم کو اپنا کر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے آواز بلند کی۔ بھائی پر مانند بھی جیل سے رہائی کے وقت اس اسکیم کو ساتھ لائے، خدا جانے اپنی فکر سے لائے یا کسی اور نے دی تھی۔ مگر جب لندن میں گول میز ہوئی تو ہندو مسلم حل کے لئے یہ اسکیم نہ مسٹر جناح کو یاد آئی اور نہ ڈاکٹر اقبال مرحوم اور دیگر مسلم لیگی اور مسلم کانفرنسی لیڈروں کو جو گول میز کانفرنس میں شریک ہوتے رہے۔ حالانکہ اس اسکیم کے پیش کرنے کا بہترین موقع وہی تھا۔ اگر یہ اسکیم مسلم لیگ کے نزدیک اہل ملک اور مسلمانوں کے لئے تسلی بخش تھی تو عین اس وقت کیوں خاموش رہے، اور وہاں یورپین طرز کی مشترکہ جمہوری حکومت اور ۱۴ ار نکات پر زور دیتے رہے۔

عذر لنگ :

کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندوؤں پر مسٹر جناح کے ہم خیالوں کو اعتماد و بھروسہ تھا۔ اس لئے اس اسکیم کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر ہر شخص جانتا ہے کہ اعتماد و بھروسہ تو اس وقت بھی نہیں تھا۔ اس وقت بھی دستوری جنگ جاری تھی اور فرقہ وارانہ فسادات ۱۹۲۷ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک بہت زیادہ پورے ملک میں ہو چکے تھے۔ ان فسادات اور مظالم سے کہیں سخت اور زیادہ ہوئے تھے جو ۱۹۳۷ء سے اکتوبر ۱۹۳۹ء تک ہوئے۔ ان حالات میں یہ کہنا کہ ہندوؤں پر اعتماد و بھروسہ تھا اس لئے یہ اسکیم بھول گئے، کوئی احمق ہی تسلیم کر سکتا ہے۔

پھر جب مسٹر جناح کے خیال میں ہندو مسلم مسئلہ کا بہترین واحد حل یہی ہے تو اعتماد اور بھروسہ کی صورت میں تو اس اسکیم کے منوانے کا بہترین وقت وہی تھا، کیونکہ وہ تو صرف اپنے لاجواب زبانی دلائل ہی کی قوت سے اس اسکیم کے منوانے کے متمنی ہیں۔ اس لئے لندن گول میز میں اس کا بہترین وقت تھا۔ مگر جب اس وقت یہ اسکیم مسٹر جناح اور کسی لیگی لیڈر نے عین وقت پر پیش نہیں کی تو کیا اس سے کسی شخص کا یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ یہ اسکیم خود ان کے نزدیک بھی ناقابل عمل اور قطعاً غیر مفید ہے، اس لئے وہاں پیش نہیں کی۔ شاید یہ کہا جائے کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس وقت چوک ہو گئی۔ اور بلاشبہ مسٹر جناح اور ان کے تمام لیگی لیڈروں سے اس وقت سخت غلطی ہو گئی۔ ہم تین کروڑ مسلمان ان کی اس عظیم غلطی کو معاف کرتے ہوئے پھر یہ دریافت کرتے ہیں کہ اچھا اس وقت غلطی ہوئی مگر یہ تو فرمائیے کہ لاہور اجلاس سے تقریباً ۱۸ ماہ پہلے سندھ کے پراونشل اجلاس میں اصولاً یہ ہی اسکیم منظور ہو چکی تھی۔ اس اٹھارہ ماہ کی طویل مدت میں آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کے پچیسیوں اجلاس ہوئے، کونسل کے بہت سے اجلاس ہوئے، اور آل انڈیا مسلم لیگ کے عام اجلاس بھی ہوئے، مگر ان اجلاسوں میں ہمیشہ مسلم اقلیت کا رونا تو بہت رویا گیا، مگر نہ یہ اسکیم منظور ہوئی اور نہ اس کا خاکہ تیار ہوا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے۔ اور اسی کے ساتھ جب یہ امر بھی سامنے رکھا جائے کہ مسلم لیگ کی ایک دستوری کمیٹی بھی پندرہ ماہ سے بنی ہوئی ہے مگر اس نے آج تک کوئی دستوری خاکہ نہیں بنایا تو معاملہ اور بھی نہایت سنگین ہو جاتا ہے۔ اور تین کروڑ مسلمان جو اقلیت کے حلقوں میں رہتے

ہیں، صرف وہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان کے سمجھ دار مسلمان اس یقین پر مجبور ہوں گے کہ مسلم لیگ کے ہائی کمانڈ اپنی مجوزہ اسکیم پر خود بھی کوئی اعتماد نہیں رکھتے، اگر انہیں اس پر اعتماد ہوتا تو اس پندرہ ماہ کے طویل عرصہ میں اپنی اسکیم کے ماتحت دستور ہند کا مفصل خاکہ تیار کر کے لاہور کے اجلاس میں پیش کرتے اور منظور کر کے شائع کردیتے۔

کیونکہ مسٹر جناح اور ان کے لائق رفقاء کار کے متعلق یہ تو خیال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کوئی دستور بنانے کی اہلیت نہیں رکھتے اور باوجود اہلیت اور کافی وقت اور مدت ملنے کے نہ بنا سکے، تو اس کی توجیہ اس کے سوا کیا ہوسکتی ہے کہ انہیں خود اس اسکیم پر کوئی اعتماد نہیں ہے اور وہ خود اس کو ناقابل عمل سمجھتے ہیں۔

لیگ کے جدید اسکیم کا پس منظر:

مگر چونکہ مسلم لیگ کی نئی زندگی صرف کانگریسی حکومتوں کے اصلی یا فرضی مظالم کی داستان پر مبنی تھی، اور انہیں مظالم کو بابار بیان کر کے لیگ کے جھنڈے کے نیچے مسلمانوں کو جمع کرنے کی کوشش جاری تھی۔ حسن اتفاق سے یورپین جنگ کے بعد مکمل آزادی کے سوال پر کانگریسی حکومتیں از خود مستعفی ہوگئیں تو عوام مسلمانوں کو کانگریس کے مظالم سے نفرت دلا کر لیگ کی طرف مائل کرنے کا بہانہ ہی ختم ہوگیا، اور عوام الناس کے جذبات کو مشتعل کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا تو مسلم

لیگ کے لئے سر دست کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کا پر فریب لفظ بول کر نا سمجھ مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کر کے لیگ کے جھنڈے کو گرنے سے بچایا جائے۔

کیونکہ غریب جاہل مسلمان جو برطانوی حکومت میں بالکل مفلس ہو گیا ہے، خود دانہ دانہ کا محتاج ہے وہ بھی یہ تصور کر کے کہ مسلم لیگ ہندوستان کے ایک بڑے رقبہ میں اسلامی راج قائم کر رہی ہے، جس کے ذریعہ مذہب کی حفاظت ہو گی۔ اپنی تمام جسمانی روحانی تکلیفوں کو بھول کر مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع رہے گا۔ تاآنکہ اسمبلیوں اور کونسلوں کے انتخابات کا زمانہ آئے تو اس اسلامی حکومت کی اقامت کے نظریہ پر الکشن میں کامیابی ہو اور اسی تخیل پر عوام کو لیگ کے جھنڈے میں پھنسائے رکھا جائے اور اسی ترکیب سے عرصہ دراز تک غریبوں کو گمراہ رکھا جاسکتا ہے۔

ایک ضروری تنبیہ :

لیگ کے ہائی کمانڈ کو یقین کرنا چاہئے کہ یہ ترکیب اور پالیسی بھی زیادہ دنوں تک کام نہیں دے گی اور ایک دن اس تدبیر باطل کا پردہ چاک ہو کر رہے گا۔ بہر حال اگر لیگ کے ہائی کمانڈ اس اسکیم پر اعتقاد بھی رکھتے ہیں تو تین کروڑ سے زیادہ مسلمانوں کا یہ مذکور الصدر سوال بدستور قائم ہے کہ آخر ہمارا ماتم کیوں ختم کیا گیا۔ ہم پر تو آج

بھی مظالم اسی طرح ہو رہے ہیں جس طرح کانگریسی حکومتوں کے زمانہ میں تھے۔ فسادات بھی ہو رہے ہیں، مسلمان شہید اور زخمی بھی ہو رہے ہیں، قربانی گاؤ پر پابندیاں بھی عائد ہوتی رہتی ہیں۔ اب ہم پر کیوں رحم نہیں کیا جاتا اور پہلے کیوں کیا جاتا تھا، بلکہ اب ہم سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے چھ کروڑ بھائیوں کے لئے اپنے کو قربان کر دو، اپنے کو قربان کر دو۔ یہ بات تو پہلے بھی کہی جا سکتی تھی، ڈھائی سال تک خواہ مخواہ ہمیں کیوں پریشان کیا گیا۔

مسٹر جناح سے دوسرا سوال:

اسی کے ساتھ یہ تین کروڑ مسلمان مسلم لیگ کے ہائی کمانڈ سے یہ بھی سوال کر سکتے ہیں کہ جب چھ کروڑ مسلمانوں کی آزادی کے مقصد سے دو کروڑ مسلمانوں کے لئے ہندوؤں کی غلامی قبول کر لی جا سکتی ہے تو اسلامی ممالک کے تقریباً ۲۰ ـ ۲۵ کروڑ مسلمانوں کی کامل آزادی اور برطانوی شہنشاہیت کی ہوس جہانگیری سے نجات دلانے کے لئے پورے آٹھ نو کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ہندو اکثریت کی غلامی کیوں گوارہ نہیں کی جا سکتی ہے۔

عقلی اور شرعی نقطہ نظر سے اس صورت میں اور مسٹر جناح کی تجویز کردہ صورت میں کیا فرق ہے اس کو واضح کریں۔ اس وقت لیگ اور مسٹر جناح سے مسلم اقلیت والے صوبوں کے تین کروڑ مسلمان اس سوال کا جواب دریافت کرنے میں

اس لئے حق بجانب ہیں کہ تحریک خلافت اور تحریک آزادی سے مسلمانوں کو علیحدہ رکھنے کے لئے ہمیشہ یہی دلیل بیان کرتے رہے کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے۔ اور ان کی اس دلیل کا جواب آزادی پسند اور سر فروش مسلم جماعتوں اور افراد کی طرف سے ہمیشہ یہی دیا گیا کہ ہم اولاً اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ ہم ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے، لیکن اگر بفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ایسا ہی ہو گا، جب بھی ہندوستان کی آزادی سے اسلامی ممالک کے ۲۰۔۲۵ کروڑ مسلمان تو برطانوی شہنشاہیت کے تسلط سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائیں گے۔ مگر اس جواب سے مسٹر جناح ٹائپ کے لوگ جو اس وقت لیگ کے رہ نما ہیں کبھی مطمئن نہیں ہوتے، اور اسی وجہ سے یہ لوگ تحریک آزادی کے مخالف رہے اور علیحدہ رہے۔

مکمل آزادی اور فرقہ وارانہ مسائل :

پس اگر آج بیس برس کے بعد مسٹر جناح اور ان کے ہم خیالوں کو آزادی پسند مسلمانوں کی دلیل کی سچائی پر یقین ہو گیا ہے تو پھر وہ کیوں تحریک آزادی میں بلا چوں و چرا حصہ لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اور کیوں کانگرس اور ہندوؤں سے صدق دل سے نہیں کہتے کہ ہندوستان کی کامل آزادی کی جدو جہد شروع کرو ہم ساتھ ہیں، یا یہ کہیں کہ ہم شروع کرتے ہیں تم ساتھ دو، اور خواہ مخواہ کے لئے کیوں وہ فرقہ وارانہ مسائل کے عدم انفصال کو آزادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔ اگر برطانوی حکومت ایسا کرتی ہے تو اس کے لئے یہ زیبا نہیں ہو سکتا ہے۔ مگر مسٹر جناح جیسے

لوگوں کے لئے تو اب خود ان کی دلیل کی روشنی میں فرقہ وارانہ مسائل کے عدم انفصال کو رکاوٹ قرار دینے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔

بہر حال مسلم اقلیت والے مسلمانوں کو جن کی تعداد بقول مسٹر جناح دو کروڑ ہے، یقین کر لینا چاہیے کہ دو ڈھائی سال سے جس کے لئے مسلم لیگ ماتم کر رہی ہے، اب لیگ انہیں ہمیشہ کے لئے فراموش کرنے کے لئے آمادہ ہو گئی ہے، بشرطیکہ ان کی مجوزہ اسکیم بروئے کار آئے۔ اور ان سوالوں کا مسٹر جناح یا ان کے ہم خیال تشفی بخش جواب نہیں دے سکتے جس کی طرف اس مضمون میں اشارات کئے گئے ہیں۔ اور سمجھ دار لوگوں کے لئے لیگ کی مجوزہ اسکیم میں دل خوش کن الفاظ کے سوا کوئی معنی نہیں ہیں۔

تاہم اس اسکیم کی لغویت کو سمجھنے اور اسلامی ضرر رسانی کا یقین کرنے کے لئے حسب ذیل امور پر غور کرنا چاہئے:

مسلم اسٹیٹ کے پر فریب لفظ کی حقیقت:

(۱) اگر ہندوستان کے ان حصوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں غیر مسلموں کی بھی آبادی باقی رکھی گئی اور ان غیر مسلم آبادیوں کو بھی وہاں کے نظام حکومت میں حصہ دیا گیا۔ جیسا کہ مسٹر جناح کے توضیحی بیان سے ظاہر ہے (خاص کر اس حصہ سے جہاں انہوں نے سکھوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے) تو اس

صورت میں ان منطقوں اور حصوں کو مسلم انڈیا اور وہاں کی حکومت کو اسلامی حکومت قرار دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

اگر اس قسم کے قطعات کا نام مسلم انڈیا اور اسلامی حکومت ہے تو وہ آج بھی موجود ہے۔ اگر ان لفظوں سے اپنے دل کو یا جاہل مسلمانوں کو خوش کرنا ہے تو وہ آج بھی پنجاب، بنگال، سندھ، صوبہ سرحد کو مسلم انڈیا اور اسلامی حکومت کہہ سکتے ہیں۔

ہاں اگر ان کی اسکیم یہ ہو کہ وہ ان حلقوں سے ایک ایک غیر مسلم کو نکال دیں گے یا یہ کہ ان حلقوں میں غیر مسلم باشندوں کو نظام حکومت میں کوئی حصہ بھی نہیں دیں گے اور ان کو محکوم محض بن کر رہنے کی اجازت دیں گے تو بلا شبہ اس صورت میں وہ ان حلقوں کو مسلم انڈیا اور مسلم اسٹیٹ یا ریاست کہہ سکتے ہیں۔ مگر ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ایسی صورت نہیں ہو گی اور نہ لیگ کے ہائی کمانڈ کے دماغ کے کسی گوشہ میں یہ تصور موجود ہے، تو پھر مسلم انڈیا اور مسلم ریاست کے بے معنی الفاظ بول کر غریب مسلمانوں کو کیوں پریشان کیا جا رہا ہے۔

دفاع، کسٹم اور خارجی پالیسی فیڈریشن کے اختیار میں ہوں گے یا اس کے اجزائے ترکیبی کے؟

(۲) مسٹر جناح مسلم اکثریت والے صوبوں یا حصوں کو علیحدہ مستقل خود مختار ریاست تجویز کرتے ہوئے ان سب کا ایک فیڈریشن تجویز کرتے ہیں۔ یعنی ایک

مرکزی اسلامی فیڈرل حکومت بھی ان کے خیال میں ہونی چاہیے۔ اسی طرح ہندو اکثریت والے صوبوں یا حصوں میں ہندو خود مختار حکومت تسلیم کرتے ہوئے ان کا ایک فیڈریشن اور فیڈرل حکومت تجویز کرتے ہیں۔

اسی طرح خود مختار دیسی ریاستوں کا فیڈریشن ہوگا، یا ریاستیں اپنی خود مختاری قائم رکھتے ہوئے ان ہی مذکور الصدر اسلامی فیڈریشن یا ہندو فیڈریشن میں شریک ہو جائیں گی۔

اسی کے ساتھ جناح صاحب ہر دو یا ہر سہ فیڈریشن کی خود مختار ریاستوں کے لئے دفاع، خارجی پالیسی اور کسٹم کے حقوق و اختیارات دینا چاہتے ہیں جیسا کہ مسلم لیگ کی تجویز کے آخری الفاظ سے ظاہر ہے۔ مگر ہر معمولی سمجھ کا آدمی جان سکتا ہے کہ کسی فیڈریشن کے اجزائے ترکیبی اور خود مختار ریاستوں کو یہ حقوق براہ راست نہیں دیئے جاسکتے ۔ یہ بات تو شاید بالکل جاہل اور احمق بھی سمجھ سکتا ہے، کیونکہ اس صورت میں فیڈریشن، اور فیڈرل حکومت کا کوئی وجود ہی نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی لئے مسلم لیگ کی تجویز کا مطلب صرف یہ ہی لیا جاسکتا ہے کہ مسلم فیڈریشن ہندو فیڈریشن اور دیسی ریاستوں کی فیڈریشن کے ہاتھ میں دفاع، خارجی پالیسی اور کسٹم کے کامل اختیارات دیں گے۔ لیکن ان امور میں ہر دو یا ہر سہ فیڈریشن کے استقلال اور مطلق العنانی کی صورت میں کوئی فیڈریشن خاص کر مسلم فیڈریشن اطمینان کی سانس نہیں لے سکتا ہے۔

فرض کیجئے کہ ہندو فیڈریشن جاپان و چین یا برطانیہ سے اپنے روابط دوستانہ

قائم کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے۔ اور مسلمان فیڈریشن اپنے اندرونی و بیرونی مفاد کو پیش نظر رکھ کر افغانستان، ایران، مصر، حجاز، ترکوں کے ساتھ روابط کو ترجیح دیتا ہے اور برطانیہ کے روابط کو مضر سمجھتا ہے، ایسی صورت میں تمام ہندوستانیوں خاص کر مسلم فیڈریشن والوں کو جن مشکلات کا سامنا ہوگا اس کے تصور سے ہر سمجھدار انسان حیران و ششدر ہو جاتا ہے۔

مرکزی فیڈریشن اور اس کی نوعیت:

لامحالہ ایک مرکزی فیڈریشن کی صورت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے جس میں ہندو فیڈریشن، مسلم فیڈریشن اور دیسی اسٹیٹ فیڈریشن برابر کے شریک ہوں، "اور اسی کے ہاتھ میں دفاع، خارجی پالیسی اور کسٹم وغیرہ کے معاملات ہوں، تاکہ ہندوستان پر خارجی حملوں کی صورت میں مرکزی فیڈرل حکومت کی رہنمائی میں پورا ہندوستان متحدہ طور پر اپنی آزادی کو قائم رکھ سکے اسی طرح بیرونی حکومت سے تجارتی معاملات وغیرہ تمام ہندوستان کے لئے اسی ایک مرکز سے متعلق ہو، ورنہ ہندوستان خاص کر مسلم فیڈریشن کے حصے اقتصادی حیثیت سے گھاٹے میں رہیں گے۔

جب خود مسلمانوں کے مفاد اور ہندوستان کی ترقی و امن کے لئے ایک اور مرکزی فیڈرل حکومت کی ضرورت ہو جائے گی، تو یہ بات سمجھنے کی ہے کہ مسلم انڈیا

پر کس قدر کافی بار بڑھ جائے گا۔ صوبہ جاتی خود مختاری کے اخراجات کے علاوہ ایک بار عظیم مسلم فیڈرل حکومت پر ہو گا۔ پھر حسب رسدی ایک بڑی رقم مرکزی فیڈرل کو ادا کرنی پڑے گی۔

اسی کے ساتھ مسلم صوبہ جات کے حلقوں کی وسعت اور اس کے مالی وسائل کو بھی غور کیجئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ مسلم حلقوں کو اپنی موجودہ بد حالی کو قائم رکھنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ چہ جائیکہ تعلیمی اقتصادی اور تمدنی ترقی کرنا، اگر کراچی بندر اور خلیج بنگال کا بندر مسلم حلقوں میں پڑے گا تو بمبئی اور مدراس کے سواحل ہندو حلقوں میں جائیں گے، اس لئے کسی شخص کو یہ دھوکا نہیں ہو سکتا کہ بیرونی تجارت اور کسٹم میں مسلم فیڈریشن کا حصہ زیادہ رہے گا۔ الغرض اس صورت میں مسلمانوں کی ترقی کا راستہ بہت حد تک مسدود ہو جاتا ہے۔ پھر یہ امر قابل غور ہے کہ جب بیرونی دفاع اور خارجی پالیسی و کسٹم کے لئے بہر حال ایک مرکزی فیڈرل حکومت کی ضرورت ہو گی، جس حکومت میں ہر فیڈریشن کے نمائندے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق شریک ہوں گے اور جس میں ریاستیں بھی شریک ہوں گی، تو اس کا آخری نتیجہ کیا ہو گا کہ اس مرکزی فیڈرل حکومت میں قدرتی طور پر پھر اکثریت غیر مسلموں کی ہو جائے گی جس سے مسلمانوں کو ڈرایا جاتا ہے۔ اس ساری دردسری کا نتیجہ کیا نکلے گا کہ مسلم صوبے گھاٹے میں رہیں گے، اور ہندو کی اکثریت کا خوف بقول مسٹر جناح بدستور مسلط ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ بخشوانے گئے نماز، گلے پڑ گیا روزہ۔ یا یوں کہئے کہ پانی کے قطروں سے بھاگ کر پرنالہ کے نیچے کھڑے ہو گئے۔

مرکزی فیڈریشن اگر نہ ہو؟

اگر مسلم فیڈریشن اور ہندو فیڈریشن اور دیسی ریاستوں کی فیڈریشن کا کوئی مرکزی فیڈریشن نہ ہو تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ان تمام فیڈریشنوں پر ایک بالادست طاقت مسلط ہو اور وہ برطانیہ ہو گی۔ گویا برطانیہ کی غلامی بدستور مسلط رہے گی۔ اور مسٹر جناح کے بیان میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ برما اور سیلون سے ہندوستان کے تعلقات کو بیان کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح برطانیہ کی طاقت برما اور سیلون اور ہندوستان کو باہم وابستہ رکھے ہوئے ہے اسی طرح مسلم فیڈریشن اور ہندو فیڈریشن کو بھی وہ وابستہ رکھے گا۔ گویا مسلم لیگ اور مسٹر جناح کو برطانیہ کی غلامی بہر حال منظور ہے۔

ان حالات میں مسلمانوں کو اچھی طرح سوچنا چاہیئے کہ مسٹر جناح انہیں کدھر لے جا رہے ہیں۔

اصلی چارۂ کار:

باقی رہا ہندو مسلم مسئلہ کا حل یا یہ کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی ترقی و بہبود اور مذہب و کلچر کی حفاظت کس اصول سے ہو سکتی ہے۔ تو اس کے لئے مسلمانوں کو جمعیۃ علماء ہند کی تجاویز اور اسکیم پر غور کرنا چاہیئے۔ جس پر کہ بعض اردو اخبارات میں کافی بحثیں ہو چکی ہیں۔ اس وقت صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ پورے ہندوستان پر

ایک مرکزی وحدانی (مونیٹری) حکومت جیسا کہ برطانیہ نے قائم کر رکھا ہے، جمعیۃ علماء ہند اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی درست نہیں سمجھتی۔ اور ۱۹۳۵ء والا مجوزہ فیڈریشن بھی در حقیقت وحدانی ہی حکومت ہے جس کا نام غلط طور پر فیڈرل حکومت رکھا گیا ہے۔

موجودہ دور جمہوریت میں ہندوستان کے کسی ایک گوشہ میں کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی جس کو صحیح معنی میں ہندو ریاست یا مسلم ریاست کہا جاسکے، حکومت بہر حال اس عہد میں مشترکہ ہوگی۔ مسلم اقلیت والے صوبوں میں بھی مسلمان ہندو کے محکوم نہیں ہو سکتے بلکہ ہر صوبہ کی حکومت میں چاہے وہ مسلم اقلیت کے ہوں یا مسلم اکثریت کے، مسلمانوں کے مخصوص تمدنی و معاشرتی احکام کے نفاذ کے لئے مستقل محکمہ قائم ہوگا اور کسی مشترکہ جمہوری حکومت کو ان معاملات میں مداخلت کا حق نہ ہوگا۔ مرکزی فیڈرل حکومت کو صوبہ جات کے تمام اندرونی معاملات اور مسلمانوں کے مذہبی و کلچرل امور میں یا ان کے مخصوص نظام میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اس کا تعلق صرف دفاع، خارجی پالیسی اور کسٹم سے ہوگا۔ (نقیب ۱۴؍اپریل ۱۹۴۰ء)

اصلاح تعلیم و نظام مدارس عربیہ

چوں کہ مدارس عربیہ اسلامیہ میں جو نصاب تعلیم رائج ہے اور جو طریق تعلیم و تربیت عموماً شائع ہے وہ ایک حد تک موجودہ ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے کافی نہیں ہے۔ انہیں وجوہ سے کثرت مدارس کے باوجود علمی کیفیت روز بروز انحطاط پذیر ہوتی جاتی ہے، اگرچہ علماء کی تعداد میں ہر سال ایک غیر معمولی اضافہ ہوتا رہتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سے حضرات کے دلوں سے مدارس عربیہ اسلامیہ کی وقعت زائل ہوگئی ہے اور انہیں وجوہ سے ملک مین ایک عام بددلی پھیلتی جاتی ہے، اس لئے جمعیت علماء بہار کا یہ جلسہ (جس میں ارکان جمعیت علماء بہار کے علاوہ مدارس اسلامیہ صوبہ بہار کے مدرسین و مہتممین و دیگر اہل الرائے شریک ہیں) متفقہ طور پر یہ تجویز کرتا ہے کہ اسلامی عربی تعلیم کو ترقی دینے اور اس کی عزت و وقار کے قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ عربی تعلیم کو زیادہ مفید و باثر بنانے اور تمام مدارس اسلامیہ کی عظمت بڑھانے کے لئے حسب ذیل اصول اختیار کئے جائیں:

(الف) صوبہ بہار کے تمام مدارس عربیہ اسلامیہ میں ایک ہی نصاب رائج کیا جائے اور موجودہ نصاب مروج میں جس امور کی ضرورت ہو اس کو لحاظ

کرتے ہوئے کمی بیشی کر کے نصاب کی مزید تکمیل کی جائے۔

(ب) صوبہ بہار کے تمام مدارس اسلامیہ کے لئے ایک مجلس ممتحنہ قائم کی جائے جس کے اندر نہایت لائق و فائق مدرسین شریک ہوں، یہی مجلس تمام مدارس کے امتحان کے اصول و نوعیت باعتبار کتاب و درجات قائم کرے اور تمام مدارس کے نتائج کو باضابطہ شائع کیا جائے اور بغیر کامیابی طلبہ کو ترقی نہ دی جائے لیکن جامعہ کلیہ (جو آئندہ قائم ہوگا) کے امتحانات میں اگر کسی خاص ایک مضمون میں ناکامیاب ہو جائے تو اس کا دوبارہ امتحان اسی مضمون خاص میں لیا جائے اور بصورت کامیابی ترقی دی جائے اور نیچے درجے کے امتحانات میں ہر مدرسہ کے مدرس اعلیٰ ناکامیاب طلبہ کو ان کی استعداد کی بنا پر ترقی دے سکتے ہیں۔

(ج) تمام صوبہ کے اندر درجہ متوسط سے اعلیٰ تعلیم تک کے درجات میں جو لڑکے سب سے اعلیٰ کامیابی حاصل کریں ان کے لئے ایک سال تک انعامی وظیفہ مقرر کیا جائے۔

(د) صوبہ بہار کے جملہ مدارس اسلامیہ میں نہایت پابندی کے ساتھ یہ نظام قائم کیا جائے کہ جو لڑکا کسی مدرسہ سے نکل کر کسی اور مدرسہ میں داخل ہونا چاہے تو جب تک وہ سابق مدرسہ کی سند پیش نہ کرے داخل نہ کیا جائے، اس صوبہ میں اس کی پابندی کے بعد بیرونی صوبہ کے مدارس سے بھی معاہدہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ طلبہ کی لاپرواہی کا سدباب ہو جائے اور تعلیم و تربیت

کی نگرانی کامیاب ہو سکے لیکن اگر کوئی لڑکا سند نہ پیش کرنے کی وجہ سے سابق مدرسین کی عدم توجہی یا مدرسین و مہتممین کے دوسرے ناجائز وجوہ کو بیان کرے تو ایسی صورت میں اہل مدرسہ کا فرض ہوگا کہ کامل تحقیقات کے بعد لڑکے کے بیان کردہ وجوہ کے ثابت ہونے کی صورت میں اس کو داخل مدرسہ کرلیں۔

(س) اور اگر کوئی طالب علم کسی معقول وجہ سے کسی دوسرے تعلیم گاہ میں جانا چاہئے اور اس کی سند اہل مدرسہ سے طلب کرے تو اہل مدرسہ کا فرض ہوگا کہ اس کو دیدیں۔

(ہ) صوبہ بہار کے کسی ایک بڑے مدرسہ کو جامعہ کلیہ کا درجہ دیا جائے۔

اس کے بعد مولانا سید محمد عثمان غنی صاحب نائب ناظم جمعیت علماء بہار نے جناب مولانا جمیل احمد صاحب سیوانی (جو ایک نہایت معمر بزرگ ہیں اور ضعف پیری کے سبب سے تشریف نہ لا سکے تھے) کی تحریر (جو اصلاح درس کے متعلق تھی اور جس میں علماء کو مفید نصیحتیں تھیں) پڑھ کر سنائی جو بہت پسند کی گئی اور علماء نے مولانا موصوف کا شکریہ ادا کیا۔ بعد ازیں عزیزی مولوی عزالدین سلمہ ندوی نواسہ جناب مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواڑی نے باجازت جناب صدر ایک مختصر عربی تحریر پڑھ کر سنائی اور بعد پڑھنے ناظم کے حوالے کردی، اس تحریر میں علماء بہار کے مسئلہ تعلیم اور اصلاح درسی کے خیال و عزم پر مسرت وانبساط ظاہر کیا گیا تھا۔ چوں کہ اس جلسہ میں غیر علماء بھی بتعداد کثیر شریک تھے

اس لئے جناب شاہ فصیح احمد صاحب کاظمی ایف۔اے نے جناب صدر سے خواہش ظاہر کی کہ اس جلسہ میں ہم لوگ بھی مدعو ہیں جو عربی نہیں جانتے اس لئے ہم لوگوں کے لئے صاحب تحریر ترجمہ بیان کردیں، چنانچہ مولوی عزالدین سلمہ بیان کرنا چاہتے تھے کہ جناب صدر نے ان کو منع کیا اور فرمایا کہ مجھے کچھ کہنا ہے میں اس کا خلاصہ کہہ دیتا ہوں، چونکہ وقت زاید صرف ہوچکا ہے، چنانچہ جناب صدر صاحب نے خلاصہ مضمون بیان کردیا اور مضمون کی حیثیت سے جو غلطیاں تھیں ان کے بعض کی اصلاح فرمائی، بعدہ مولی عزالدین سلمہ نے کہا کہ آج کی رات کو میں نے عجلت میں لکھا ہے اس کی پوری تصحیح بھی نہیں ہوئی ہے، لہذا میری تحریر ابھی واپس کردی جائے تاکہ نظر ثانی کے بعد میں داخل دفتر کروں، چنانچہ ان کی تحریر اسی وقت ان کو دیدی گئی، (جو ابھی تک نہیں آئی ہے) اس کے بعد احقر ناظم جمعیت علماء بہار واڑیسہ نے علماء حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ عرض کیا کہ اس مسئلہ کو تو آپ حضرات نے باتفاق طے فرمایا ہے، لیکن ایک اور اہم مسئلہ رہ گیا ہے جس اس مسئلہ سے کم اہم نہیں ہے اور وہ ابتدائی مکاتب کے نصاب کا مسئلہ ہے، اس کے لئے انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ آپ حضرات کو تکلیف دی جائے گی، لیکن آپ حضرات اس پر آج ہی سے غور وخوض شروع کردیں کہ وہ نصاب کن اصولوں پر بنایا جائے اور کس حد تک رکھا جائے اور جو حضرات اس کے متعلق کوئی مسودہ تیار کریں ہمارے نام روانہ فرمائیں۔ تاکہ

ترتیب میں مجھے سہولت ہو اور آئندہ آپ کو بھی آسانی ہو اسی سلسلہ میں ناظم نے یہ بھی بتایا کہ کتابی تعلیم اور مذہبی تعلیم و تعلم کلیۃً و عموماً فرض ہے اور یہ فرض زبانی تعلیم سے پوری ہو سکتی ہے، اس پر بھی غور کرنا چاہئے۔ بعدہ حضرت صدر نے جلسہ کی کامیابی پر مسرت کا اظہار فرمایا اور دعاء خیر پر نہایت کامیابی کے ساتھ جلسہ ختم کیا۔ اس کے نصف گھنٹہ کے بعد مجلس منتظمہ جمعیت علماء بہار کا اجلاس بصدارت جناب مولانا عبد الوہاب صاحب شروع ہوا حسب ذیل ارکان شریک تھے۔

مولانا عبد الوہاب صاحب صدر ، مولانا شاہ نور الحسن صاحب پھلواری، مولانا عبد الشکور صاحب لوگانواں ، مولانا نور الدین صاحب مہونی، مولانا شاہ قمر الدین صاحب پھلوری، مولانا سید شاہ عثمان غنی صاحب گیا، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب گیا، مولانا شاہ ابوالخیرات صاحب سیوان، مولوی حافظ محمد ثانی صاحب بتیا، مولانا نعمت اللہ صاحب مظفر پور، مولانا حکیم عبد العزیز صاحب دربھنگہ ، مولانا عبد الصمد صاحب مونگیر ، مولانا حکیم محمد یعقوب صاحب مونگیر ، مولوی سید ظہور الحسن صاحب بھاگلپور۔

اور حسب ذیل تجویزیں باتفاق منظور ہوئیں:

(۱) یہ جلسہ اجلاس جمعیت منتظمہ منعقدہ ۵ر جمادی الآخر ۴۳ھ کی کارروائی کو منظور کرتا ہے۔

(۲) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ تجویز (۵) جلسہ منعقدہ ۹ر ربیع الاول ۱۳۴۳ھ

کے مطابق جلد کارروائی کی جائے۔

(۳) یہ جلسہ حسب ذیل دس حضرات کو (حسب قاعدہ نمبر) مجلس منتظمہ جمعیت علماء بہار کارکن منتخب کرتا ہے۔

مولانا محمد ابراہیم صاحب دربھنگہ، مولانا عبد الغنی صاحب شیخپورہ، مولانا ابوالکمال محمد یعقوب صاحب لکھرانواں ضلع پٹنہ، مولوی عبد الباری صاحب وکیل دربھنگہ، مولانا سید شاہ انور صاحب اہلحدیث مونگیر، مولانا حکیم مولوی عالم صاحب بختیارپور پٹنہ، مولانا فصیح احمد صاحب کاظمی بہار شریف، مولانا عبدالحکیم صاحب مدرس مدرسہ انوار العلوم گیا، مولانا عبد الہادی صاحب پھلواری شریف ضلع پٹنہ، مولوی منظر علی ندوی مالک برقی پریس پٹنہ وایڈیٹر النشر۔

(۴) یہ جلسہ اس تجویز کو جو تعلیمی جلسہ مشترکہ میں پاس ہوا ہے باتفاق منظور کرتا ہے (جو اوپر درج ہوا ہے)۔

اخیر میں جناب سید شاہ محمد قاسم صاحب بیرسٹر و ممنوبی صغریٰ وقف) سٹیٹ کا شکریہ ادا کیا گیا کہ جناب موصوف کے حسن انتظام سے جلسہ کامیاب ہوا اور آپ نے مدرسہ عزیزیہ میں مہمانان جمعیت کے قیام وطعام اور آسائش و آرام کا کافی سامان و نظم فرمایا۔ جزاھم اللہ خیرا، مدرسین وطلبہ مدرسہ عزیزیہ کا بھی شکریہ ادا کیا گیا کہ انہوں نے ہر طرح کا خیال رکھا۔

ابوالمحاسن محمد سجاد کان اللہ لہ

ناظم جمعیت علماء بہار واڑیسہ

ضلع پورنیہ (۱) کا دورہ

مسلمانوں کا جوش و خروش

خوش آئند توقعات

(۱)

ضلع پورنیہ ہمارے صوبہ بہار واڑیسہ کا ایک نہایت معروف و مشہور ضلع ہے جو تمام اضلاع صوبہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تمام صوبہ بہار واڑیسہ کے مسلمانوں کی قوت باعتبار آبادی جو کچھ ہے وہ ضلع پورنیہ کے مسلمانوں کی وجہ سے ہے، کیوں کہ ایک چوتھائی سے زیادہ آبادی مسلمانوں کی اسی ضلع میں ہے اور تین چوتھائی سے کم بقیہ بیس اضلاع کے اندر، میں بھی اس امر سے متفق ہوں کہ یہ بات بالکل سچ ہے کہ اس صوبہ کے مسلمانوں کی سب سے زیادہ قوت ضلع پورنیہ کی سرزمین میں ودیعت ہے، اگرچہ آبادی کا اندازہ جو بیان کیا جاتا ہے وہ میرے نزدیک بالکل ناقابل اعتبار ہے، بلکہ میرے خیال میں ضلع پورنیہ میں مسلمانوں کی آبادی اس مقدار سے کہیں زیادہ ہے جو ظاہر کی جاتی ہے کیوں کہ آبادی کے صحیح مقدار کے معلوم

---

(۱) پورنیہ ضلع سے مراد اس وقت کا پورنیہ ہے جب اس میں کٹیہار، اررِیہ، کشن گنج وغیرہ شامل تھے اب یہ سب خود اضلاع ہو گئے ہیں۔ اس مضمون میں جن مقامات کے نام آئے ہیں وہ اکثر ارریہ ضلع سے متعلق ہیں (مرتب)

کرنے کے لئے قومی طریقہ پر آج تک کوئی سعی نہیں کی گئی، نہ کوئی تدبیر اس کے لئے اختیار کی گئی جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس کا دار و مدار صرف سرکاری رپورٹوں پر ہے اور سرکار بہادر کے ہزاروں کام کی طرح اس باب میں بھی اس کی رپورٹ قابل اعتبار نہیں کہی جاسکتی۔ جس کا اظہار جریدہ امارت کے ذریعہ گذشتہ سالوں میں کیا جاچکا ہے اور آج بھی یہ سن لیجئے کہ ہر جگہ کی آبادی تقریباً ہر قوم کی کچھ نہ کچھ بڑھ رہی ہے، مگر سرکاری رپورٹ ضلع پورنیہ کے مسلمانوں کی آبادی کو نہایت تیزی کے ساتھ گھٹا رہی ہے، چنانچہ سرکاری رپورٹ ۱۹۱۱ء ظاہر کرتی ہے کہ مسلمانوں کی آبادی ضلع پورنیہ میں آٹھ لاکھ اکتیس ہزار دو سو ستائیں ہے اور ہندوؤں کی آبادی گیارہ لاکھ چھبیس ہزار آٹھ سو تینتالیس ہے، یعنی ہندوؤں سے مسلمانوں کی آبادی صرف بمقدار دو لاکھ پنچانوے ہزار چھ سو سولہ کم ہے، لیکن پھر سرکاری رپورٹ ۱۹۲۱ء بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی کل آبادی ضلع پورنیہ میں آٹھ لاکھ چودہ ہزار چار سو دو ہے یعنی دس سال کے اندر اس ضلع میں مسلمانوں کی آبادی سولہ ہزار آٹھ سو پچیس کم ہوگئی اور ہندوؤں کی آبادی گیارہ لاکھ چھیاسی ہزار تیس ہے، یعنی ہندو دس سال کے اندر بمقدار اونسٹھ ہزار ایک سو ستاسی زیادہ ہوگئے۔

اس ضلع میں تو بفضلہ تعالیٰ طاعون بھی نہیں ہوتا، ہاں! کبھی کبھی ہیضہ ہوتا ہے، مگر کیا اس وبا میں ہلاکت سب مسلمانوں ہی کے لئے ہے؟ دوسری

قومیں بالکل محفوظ رہتی ہیں ؟ یا خدانخواستہ مسلمانوں میں توالد و تناسل کا سلسلہ بند ہو گیا ہے، الغرض سرکاری رپورٹوں کا یہ حال ہے جس پر ہماری مسلم آبادی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

چوں کہ ان دنوں تعداد اقوام کو سیاسی دنیا میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے، اس حیثیت سے مسلمانان بہار کی واقفیت کے لئے آج پھر سرکاری رپورٹ کی حقیقت واضح کر دی گئی تا کہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ تمہارے ساتھ کس قدر انصاف کیا جاتا ہے اور اگر تم سیاست کے میدان میں تعداد کی قوت سے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو پھر دوسروں کی رپورٹوں پر اعتماد نہ کرو اور خود اس کی تدبیریں سوچو اور عملی میدان میں قدم رکھو، اس کی اگر کوئی آسان صورت ہے تو وہی ہے کہ امارت شرعیہ جس طرح گاؤں گاؤں محلہ محلّہ کو منظّم کر رہی ہے ہر جگہ نقیب مقرر کر رہی ہے اسی تنظیم کے ماتحت یہ مشکل بھی حل ہو گی۔

ضلع پورنیہ میں یہ ہمارا چوتھا سفر تھا، دو مرتبہ صرف پورنیہ شہر تک انفرادی حیثیت سے جانا ہوا اور جلسوں کی شرکت کے علاوہ وقتی طور پر امارت شرعیہ کے نقطۂ نظر سے جو کچھ خدمت ممکن ہوئی انجام دے کر فوراً چلا آیا، تمام احوال پر پورے طور پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔

اور تیسری مرتبہ امارت شرعیہ کے وفد کے ساتھ جانا ہوا، لیکن اس مرتبہ بھی ارریہ اور فاربس گنج کے علاوہ ایک دو مقامات میں جانا ہوا، دیہاتوں کی طرف جانا اور باشندگان دیہات کے احوال پر غور کرنے کا اتفاق کم ہوا۔

لیکن اس مرتبہ جو چوتھا سفر تھا بحمد اللہ ایک کافی حد تک دیہاتی بھائیوں سے ملنے اور ان کے احوال پر غور کرنے اور ان کو نیک مشورہ دینے کا موقعہ ملا، چوں کہ بہت عرصہ سے تقاضا تھا کہ مفصلات کے اکثر مقامات میں وفد امارت کا دورہ ہو مگر ہمیشہ عدیم الفرصتی مانع آئی۔ مگر اس مرتبہ ہم نے بھی تمام کاموں کو ایک حد تک مؤخر کر کے ضلع پورنیہ کے لئے کافی وقت دینے کا فیصلہ کیا تھا اور ارادہ تھا کہ ہر ہر تھانہ میں جاؤں اور ہر تھانوں میں چند جگہ قیام کر کے پورے تھانہ کے مسلمانوں سے ملاقات کرلوں تاکہ تمام مسلمانوں کی مذہبی و قومی ضروریات کا اندازہ کر کے کام کیا جائے، اگرچہ مبلغین امارت کے ذریعہ یہ کام ہوتا رہتا ہے تاہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی حاجت باقی رہتی ہے اور بہت سے امور بغیر خود معائنہ کے حل نہیں ہوتے، چنانچہ امید تھی کہ تین چار ماہ میں یہ کام انجام پاجائے گا، اگرچہ ہمارے بھائی مجیب الرحمٰن صاحب رئیس چند روئی(۱) کی خواہش تھی کہ مجھ کو تین ماہ تو صرف اررریہ سب ڈویزن کیلئے دینا چاہئے اور اس پر آج تک ان کا اصرار ہے۔

خیر ابھی چند ہی تھانوں میں دورہ ہونے پایا تھا کہ بعض نہایت ضروری کاموں کے لئے پھلواری شریف سے بذریعہ تار طلبی آئی، اس لئے مجبوراً مجھے واپس آنا پڑا، اس لئے ہم ان تمام مقامات کے مسلمانوں سے جن کے لئے تاریخیں متعین ہو چکی تھیں معافی چاہتے ہیں کہ ہم ان کی امیدوں کو پورا نہ

---

(۱) چند روئی اس وقت اررریہ ضلع کا ایک معروف گاؤں ہے۔

کر سکے اور انشاء اللہ تعالیٰ ہم کوشش کریں گے کہ جلد کوئی موقع ملے تاکہ وعدہ پورا کیا جاسکے۔

اس دورہ کے مفصل احوال تو مولانا عبد الہادی صاحب لکھیں گے جو برکات امارت شرعیہ کے ذیل میں انشاء اللہ تعالیٰ شائع ہوتے رہیں گے، مگر میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ضلع پورنیہ کے مسلمانوں کو جیسا میں نے پایا اور جو جو خوبیاں کہ ان میں موجود ہیں، ان سب کو میں خود بھی اپنے قلم سے لکھوں اور جو جو خرابیاں ہیں، اس کو بھی ظاہر کردوں کہ یہ کمی پوری ہو جائے اور یہ ضلع جس طرح بقیہ ۲۰ اضلاع پر باعتبار اسلامی آبادی فوقیت رکھتا ہے، دیگر حیثیتوں سے بھی ممتاز ہو جائے، لیکن قبل اس کے کہ میں ان تمام باتوں کو لکھوں، سب سے پہلے میں اپنے ان تمام بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے نہایت جوش وخروش کے ساتھ ہر جگہ ہم لوگوں کا استقبال کیا اور نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ مہمان نوازی کے فرائض انجام دیئے اور جن باتوں کی ہدایت کی گئی ان پر عمل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، پورے جوش وعقیدت کے ساتھ امارت شرعیہ کے احکام تسلیم کرنے اور اس کی تنظیم کو مضبوط کرنے میں عملی حصہ لیا، بیت المال کے لئے (دوامی امداد کے لئے اصولوں کے پابند رہنے کے علاوہ) وقتی طور پر بھی سب ملا کر دو ہزار سے زائد کی رقم اس وقت پیش کردی جس کی تفصیل حسابات کے ذیل میں آئندہ شائع ہوگی۔

جزاهم الله خير الجزاء

ہمارے اس دورہ کے انتظامات میں یوں تو ہمارے سینکڑوں بھائیوں نے خصوصیت کے ساتھ حصہ لیا۔ اس لئے ان حضرات کا شکریہ مجھے خصوصیت کے ساتھ ادا کرنا چاہئے، اس وقت سب نام تو محفوظ نہیں ہیں مگر جن حضرات کے نام اس وقت یاد آگئے ان کے اسماء کے اظہار پر اکتفا کرتا ہوں۔

منشی(۱) بابو عطاء الرحمٰن صاحب رئیس بلوات، منشی بابو سلیم الدین صاحب. رئیس موضع کسیلہ، منشی بابو محرم علی صاحب رئیس موضع ڈہٹی، منشی میر جلال صاحب، منشی اسد اللہ صاحب، منشی بدر الدین صاحب، حاجی حکیم الفت حسین صاحب، منشی نور الاعظم صاحب رؤساء ہلدی کھوڑا، مولوی سید شاہ محمد یوشع صاحب، حکیم فضل الرحمٰن صاحب موضع سونتھا، منشی محمد یعقوب صاحب، قاری قربان علی صاحب، منشی عقرب علی صاحب، امین در بھنگوی، معبود بخش صاحب (نقیب) دولا، منشی احمد اللہ صاحب (نقیب) منورا پچھم، منشی عبد الجبار صاحب (نقیب) منورہ، منشی نبی بخش صاحب، منشی بچہ میاں صاحب، جناب حاجی فخر الدین صاحب، حاجی محمد سعید صاحب رؤساء سنگھیا، منشی عبد الرؤف صاحب وغیرہ، بائسی امام الدین صاحب تحصیلدار، شیخ چھوتہرو صاحب رئیس لاہل، منشی تمیز الدین صاحب، منشی سراج الدین صاحب نقباء گریا، جناب منشی عبد اللطیف صاحب رئیس ہقنیا، منشی قائم علی صاحب رئیس و (نقیب) ڈمراہ، جناب مولانا سخاوت حسین صاحب، مولوی غیاث الدین

(۱) مذکورہ حضرات اور مواضعات اس وقت ضلع اریہ سے متعلق ہیں جو اس وقت ضلع پورنیہ ہی کا حصہ تھے۔ (مرتب)

صاحب، خواجہ احمد حسین صاحب (نقیب) وریئس فقیر ٹولی، منشی یاد علی صاحب (نقیب) ٹیٹھا، شیخ مقبول علی و مقصود علی رؤساءِ رامپور، شیخ مقصود ولد شیخ بوکائی مرحوم رئیس رامپور، باب مقبول علی ولد حسین بخش مرحوم وئیس رام پور، بابو محمد اسماعیل صاحب بٹور باڑی، منشی عبد المجید صاحب جھاگا چھی، منشی طالب حسین صاحب تحصیلدار و (نقیب) سید پور بھن ٹولی، منشی احمد حسین صاحب (نقیب) بستہ ڈانگی، منشی بہاء الدین ولقمان صاحبان نقباء گھاٹ پٹھن ٹولی، منشی بحر الدین صاحب (نقیب) کھوکسا، منشی محمد حسین صاحب، منشی لیاقت حسین صاحب، مولوی احمد حسین صاحب، منشی عماد الدین صاحب، مولوی محی الدین صاحب، حکیم ظہیر الدین صاحب، مولوی بشیر الدین صاحب، پیر علی شاہ صاحب، مولوی ابو الحسن صاحب، شیخ عزیز بخش صاحب رامپور وغیر ہم۔ ان میں علماء بھی ہیں، رؤساء بھی، اطبا بھی، ان میں بہت سے لوگ اپنے اپنے حلقہ کے نقباء بھی ہیں، اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزاء خیر عنایت فرمائے، ان لوگوں نے اپنے ذوق و شوق کے مطابق نہایت خلوص کے ساتھ جلسوں کے لئے بہتر انتظامات کئے، اررىہ وبلوات کے جلسوں میں خیر مقدم میں قصیدے و نظمیں بھی پڑھی گئیں اور پیش کی گئیں، جس کے اندر اپنے دلی جذبات و حسیات وامارت شرعیہ کے ساتھ عقیدت کا اظہار کیا گیا، اگرچہ وہ ادبی حیثیت سے شعراء کے نزدیک زیادہ وقیع نہ ہوں، لیکن جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اس میں شک نہیں کہ وہ نہایت قیمتی ہیں۔

سادگی:

مسلمانانِ پورنیہ کے محاسن میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ ان کی سادگی ہے کیوں کہ ان کی زندگی اور طرز معاشرت عام طور پر تکلفات سے بَری ہے۔

اگرچہ دیہاتی زندگی عموماً دیگر اضلاع میں بھی شہری زندگی کے اعتبار سے سادہ ہے اور نسبۃً تکلف سے بَری، لیکن پورنیہ ضلع کے مسلمانوں کی سادگی عموماً نمایاں حیثیت رکھتی ہے، کیوں کہ دیگر اضلاع کے دیہاتی مسلمانوں میں جو سادگی ہے وہ بہت زیادہ حد تک اضطراری ہے اور اس کی وجہ زیادہ تر ناداری وافلاس ہے لیکن پورنیہ ضلع کے مسلمان بحمد اللہ عموماً مفلس ونادار نہیں ہیں، ان کی مالی حالت نسبۃً بہت بہتر ہے، بڑی بڑی جائدادوں کے مالک ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے تمام طرز معاشرت میں آج تک سادگی کو ملحوظ رکھا ہے حتی کہ رہائش کے مکانات ابھی تک بہت کم اینٹ وچونہ کے رہین منت ہیں، خورد ونوش ولباس بھی بالکل سادہ ہے، معمولی کپڑے پہنتے ہیں، وضع و قطع بھی قدیم ہے، ابھی تک تمدن جدید کے اثرات سے بہت ہی کم متأثر ہوئے ہیں، خصوصیت کے ساتھ جب ان رئیسوں کی طرز معاشرت پر غور کیا جائے جن کے شہری

تعلقات وسیع ہیں، حکام ضلع سے بھی مراسم ہیں، کلکتہ و بمبئی جیسے متمدن شہروں کی سیاحت اور تمام جاذب قلوب امور کے مشاہدہ کرنے کے بعد بھی آج تک وہ اپنی سادہ طرز معاشرت پر قائم ہیں تو اس سادگی پر تعجب ہوتا ہے۔ اس لئے اہل پورنیہ میں خدا کے فضل سے سادگی ایک ایسی نعمت ہے جس پر اہل پورنیہ جس قدر ناز کریں بجا ہے اور ان کی یہ سادگی باوجود خوشحالی دوسرے اضلاع کے مسلمانوں کے لئے سبق آموز ہے، میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ پاک تمام مسلمانوں کو تکلف بیجا سے بچائے اور اہل پورنیہ کو ہمیشہ سادہ زندگی پر قائم رکھے۔

لیکن اسی کے ساتھ بعض امور میں سادگی حد سے تجاوز کر گئی ہے جس کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے کیوں کہ ایسی سادگی محمود نہیں کہی جاسکتی جو شریعت کے حدود سے ٹکرائے یا مروت محمودہ کے خلاف ہو۔

عورتوں کا لباس عموماً پورے پورے طور ساتر نہیں ہوتا کیوں کہ عموماً عورتیں کرتہ نہیں پہنتیں جیسا کہ خود ہم سے پورنیہ کے بھائیوں نے بیان کیا، حالاں کہ عورتوں کا تمام بدن سر سے پاؤں تک سوائے چہرہ و ہتھیلی کے عورت ہے، اس لئے تمام بدن کو کپڑے سے ڈھکا رہنا چاہئے، پس یہ سادگی نہیں ہے بلکہ شریعت کے حدود سے تجاوز ہے، جو غالباً محض ناواقفیت پر مبنی ہے، اس لئے تمام رؤساء و سمجھدار مسلمان بالخصوص ہمارے نقباء کا فرض ہے کہ وہ عورتوں کو کرتہ پہننے پر مجبور کریں جو پورے آستین کا ہو اور کم از کم کمر تک نیچا ہو، اسی طرح پورنیہ

ضلع میں یہ عام دستور ہے کہ قضائے حاجت کے لئے بیت الخلاء (پائخانہ) نہیں ہوتا، یہ رواج بھی قابل ترک ہے بالخصوص عورتوں کے لئے تو ضرور گھروں کے احاطہ میں سنڈاس بنانا چاہئے تاکہ عورتوں کی عزت ووقار میں اضافہ ہو اور اگر مردوں کے لئے بھی بیت الخلاء بنایا جائے تو بہت بہتر ہے تاکہ بے شرمی وبے حیائی کا خوف کسی وقت دامنگیر نہ ہو، لیکن عورتوں کے لئے بیت الخلاء نہ بنانا اور ان کو قضائے حاجت کے لئے میدان جانے کے لئے مجبور کرنا سخت بے غیرتی ہے، بالخصوص اس دور فتن میں۔ روٗساء اور ہمارے نقباء کرام کو اس پر خصوصیت سے توجہ کرنی چاہئے، ہمارے پورنیہ کے بھائیوں کے لئے یہ کوئی مشکل امر نہیں ہے، کیوں کہ بحمد اللہ زمینیں ان کے پاس وافر ہیں جہاں اپنے لئے اور جانوروں کے لئے متعدد گھر بنائے جاتے ہیں ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہر گھر میں سنڈاس کے لئے بھی بنالیا جائے تو کوئی دقت نہیں ہے۔

اسلامی جذبہ:

دوسری چیز جو پورنیہ کے مسلمانوں میں قابل قدر ہے وہ ان کا اسلامی جذبہ ہے، اگرچہ تعلیم کی بہت ہی کمی ہے مگر پھر بھی ان کے دل اسلامی جذبات سے خالی نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب ان کے کانوں تک کوئی اسلامی آواز پہونچتی ہے تو اس کی طرف ذوق وشوق سے دوڑتے ہیں اور جن امور کو انہوں نے کار ثواب سمجھ لیا ہے ان پر عمل کرنے کی سعی کرتے ہیں، ان کے اس جذبہ کا

اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اس موسم میں جب کہ فصل خریف تیار تھی اور فصل ربیع کے لگانے کا وقت تھا، تین تین چار چار کوس سے اپنے کاموں کو حرج کر کے جوق جوق لوگ مواعظ سننے کے لئے آتے تھے اور پھر اس سردی کے موسم میں بارہ ایک بجے شب تک بیٹھے سنتے رہتے تھے حاضرین میں اکثر ایسے ہوتے کہ جن کے جسم پر صرف ایک چادر ہوتی مگر وہ بغیر ختم بیان نہیں جاتے، اس باب میں عورتیں بھی مردوں سے کم نہیں معلوم ہوتیں کیوں کہ اکثر جلسوں میں عورتیں بھی دور دور سے بیل گاڑیوں پر پردہ کے ساتھ آتیں اور اگر کوئی جگہ عورتوں کے لئے پردہ کی نہیں ہوتی یا جگہ معمور ہو جاتی تو اسی گاڑی کو جلسہ گاہ کے قریب کھڑی کرا کے آخر جلس تک اسی پر بیٹھی رہتیں بعض موقع پر سو سو گاڑیاں سے زیادہ اس طرح پر کھڑی رہتیں جس کے اندر چار چار پانچ پانچ عورتیں ہوتیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی باتوں کو سننے کے لئے عورتیں بھی کس درجہ شائق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ان جذبات کو ہمیشہ قائم رکھے اور اس سے زیادہ ان کو دین کی باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرماوے کیوں کہ مذہبی حیثیت سے ان کی عملی زندگی بہتر نہیں ہے، بلکہ بہت سے مراسم ایسے رائج ہیں جو غیر اسلامی ہیں اور ان کو مراسم مشرکانہ کہنا بالکل صحیح ہے، ان مراسم کی تفصیل مولوی حافظ عبد الرحمٰن صاحب مبلغ امارت شرعیہ کی رپورٹوں میں اکثر شائع ہوا کی ہیں، بعض ناواقف لوگ ان رپورٹوں کو مبالغہ آمیز کہا کرتے

تھے مگر اس مرتبہ تمام باتوں کی تحقیق کا موقع اچھی طرح ملا، ایک ایک بات درست ثابت ہوئی اور یہ بات بھی متحقق ہوئی کہ مولوی صاحب موصوف نے کیسی جفاکشی کے ساتھ اصلاح کی ہے تاہم بہت کچھ اثرات ابھی تک باقی ہیں۔

یوں تو جہالت اور ہندوؤں کی صحبت کی وجہ سے مشرکانہ اعمال دیگر اضلاع کے کوردہ علاقوں میں بھی مسلمانوں کے اندر پائے جاتے ہیں، مثلاً مصیبت کے وقت دیبی استھان پر چڑھاوا چڑھانا، خصی بکری دینا، مرض چیچک کو چیچک ماتا مان کر او جھائی وغیرہ کرانا، مگر ان سب کے علاوہ ضلع پورنیہ میں دو چیزیں زائد ہیں ایک سبھا کی پرستش دوسرے خدائی گھر، سبھا کی حقیقت یہ کہی جاتی ہے کہ گھر میں ایک مکان محفوظ ہوتا ہے، جہاں ایک کھڑاؤں رکھی جاتی ہے سیندور وغیرہ بھی لگایا جاتا ہے، جو چیز نئی حاصل ہوتی ہے پہلے وہاں رکھی جاتی ہے، غلہ ہوا تو پہلے وہاں چڑھایا گیا، پھل ہوا تو سب سے اول سبھا کیلئے پیش کیا گیا، حتی کہ گائے بھینس نے بچہ دیا تو اس کا دودھ سب سے پہلے اسی پر چڑھایا گیا وہ مرد جن کو ان امور کی لغویت معلوم ہوگئی ہے وہ خود تو اب پرہیز کرتے ہیں لیکن بہت سی عورتیں ان ناجائز حرکتوں سے تائب نہیں ہوئی ہیں، ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ اپنے مردوں سے چھپا کر بہت سے خرافات کر گذرتی ہیں، اس مرتبہ بہت اچھی طرح ہدایت کی گئی ہے، امید ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ ان خرافات کا بالکلیہ سد باب ہو جائے گا اور خدائی گھر کی حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص اپنے گھر کے آس پاس ایک چھوٹا سا جھونپڑا تین چار

ہاتھ کا بنا تا ہے اور بعض اس سے بھی چھوٹا جس کا دروازہ بہت ہی مختصر ہوتا ہے وہاں ہر روز چراغ جلایا جاتا ہے کوئی بیمار ہوا تو اس کے گھر کے لوگوں نے وہاں پر خصی بکری لا کر ذبح کیا اور خیرات کر دیا اور قربانی بھی اسی خدائی گھر کے نزدیک کی جاتی ہے اور مریض کی صحت کے لئے کوئی گھر کا آدمی تالاب یا دریا میں جا کر غسل کرتا ہے اور وہاں سے بھیگے کپڑے پہن کر آتا ہے اور اس خدائی گھر کے سامنے تراق سے اوندھے منہ گر پڑتا ہے، تمام جسم عموماً باہر رہتا ہے اور سر اندر، کیوں کہ پورا جسم اس گھر میں جا ہی نہیں سکتا اور اسی طرح کچھ دیر پڑا رہتا ہے اور کچھ آہستہ آہستہ کہتا رہتا ہے، بعدہ وہاں سے اٹھتا ہے اور اس کے ہاتھ اور بدن میں جو کچھ خاک زمین پر گرنے سے لگتی ہے اس کو مریض کے جسم پر آکر ملتا ہے تاکہ وہ صحت یاب ہو، اس رسم کی بھی بہت حد تک بیخ کنی ہو چکی ہے۔ تاہم اکثر دیہاتوں میں اس کے اثرات موجود ہیں، اگرچہ خیالات میں کچھ اصلاح ہوئی ہے مگر اس کے زائل کرنے سے خوف کھاتے ہیں، چنانچہ ایک گاؤں میں جب کہ شب کے وقت میں نے خود ان تمام مراسم کی قبح بیان کر دیئے تھے اور لوگ رات کو تائب بھی ہو چکے تھے صبح کو میں نے دریافت کیا کہ اس بستی میں کتنے خدائی گھر ہیں جو ابھی تک نہیں توڑے گئے تو معلوم ہوا کہ صرف دو ہے، میں خود ان کو دیکھنے کیلئے گیا اور ان لوگوں کو بلا کر پھر دوبارہ سمجھایا تو وہ کہنے لگے کہ حضور آپ ہی توڑوا دیجئے اور یہ جملہ بھی کچھ گھبرائے ہوئے کہہ رہے تھے، اس وقت

مجھے وفد طائف کا مکالمہ یاد آگیا کہ وہ ایمان قبول کرتے وقت رسول اللہ ﷺ کے سامنے بہت سی شرطیں کر رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ ان کو نہایت حکیمانہ جواب دیتے جاتے تھے، آخر میں ایک شرط یہ تھی کہ اپنے بتوں کو ہم اپنے ہاتھوں سے نہ توڑیں گے، آنحضرت ﷺ نے اس شرط کو منظور فرمالیا، اور حضرت خالد ابن ولیدؓ و دیگر صحابہ کرامؓ کو بھیج کر تڑوایا جس کا قصہ طویل ہے، بہر حال میں نے بھی یہ صورت اختیار کی اور کہا کوئی حرج نہیں ہے، دوسرے توڑ دیں گے مگر مقصود میرا تو یہ ہے کہ تمہارے عقیدہ کی اصلاح ہو، آج توڑ دیا گیا، کل ہمارے جانے کے بعد پھر تم بنالو، یہ ٹھیک نہیں ہے، اس لئے ان کو پھر سمجھایا تو وہ خود بھی راضی ہوگئے، مگر میں نے مولانا عبد الرحمٰن صاحب مبلغ کو کہا کہ جائیے اور پہلے آپ توڑنا شروع کیجئے، اس کے بعد نقیب موضع پھر یہ لوگ خود بھی اپنے ہاتھوں سے بالکل صاف کردیں، چنانچہ یہ بستی اس مشرکانہ رسم سے بحمد اللہ بالکل پاک ہوگئی اور امید ہے کہ انشاءاللہ پھر دوبارہ اعادہ نہ ہوگا۔

(۳)

یہ خدائی گھر جس کو وہ لوگ کھدیا گھر کہتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک اصلاح و ترمیم کردہ اصطلاح و رسم ہے، ورنہ حقیقت میں ہندوؤں کے یہاں ایک قسم کی یہ بھی عبادت ہے کہ وہ تالاب میں غسل کر کے بھیگے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے زمین پر گرتے ہوئے کسی بت خانہ کے پاس جاکر تراق سے گرتے ہیں، یہ طریقۂ عبادت ان کے یہاں سے بھی متروک ہو رہا ہے، لیکن پھر بھی جا بجا ابھی تک یہ طریقۂ عبادت رائج ہے، چنانچہ بڑگاؤں میں جہاں ان کا ایک بہت بڑا بت ہے جو مہاد دیو کے نام سے مشہور ہے، اکثر ہندو عورت و مرد ایسا کیا کرتے ہیں۔

اسی کی مثل قریب قریب وہ رسم ہے جو پورنیہ ضلع کے جاہل مسلمان کرتے ہیں، صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں کوئی بت کا مجسمہ نہیں ہوتا، لیکن پھر بھی اس مصنوعی کھدیا گھر کے ساتھ ایک خاص قسم کی عقیدت ہے، جس کی شریعت اسلامیہ میں کوئی اصل نہیں ہے، اس لئے پورنیہ کے جس گاؤں میں اب تک اس کھدیا گھر کا وجود ہو، سب کو توڑ ڈالنا چاہئے، دوسرے اضلاع کے مسلمانوں کو یہ وہم نہ ہونا چاہئے کہ شاید وہ لوگ خدائی گھر کو مسجد سمجھتے ہوں، کیوں کہ مسجدیں تقریباً ہر گاؤں میں علیحدہ ہوتی ہیں اور مسلمانان پورنیہ بھی مسجد کو مسجد ہی کہتے

ہیں، مسجد میں اذان دیتے ہیں، جماعت سے نماز پڑھتے ہیں لیکن خدائی گھر میں صرف روزانہ چراغ جلایا جاتا ہے، وہاں نہ اذان ہوتی ہے نہ نماز، اور خود ہی وہ لوگ اس کو مسجد نہیں سمجھتے ہیں۔

مہمان نوازی:

اس ضلع کے مسلمانوں کو مہمان نوازی کا بھی ایک خاص ذوق ہے، یہ بہت اچھی صفت ہے، شریعت نے بھی اکرام ضیف کا حکم دیا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ اہل پورنیہ اسلام کے اس حق کو اپنی مشہور سادگی کے ساتھ بہت اچھی طرح ادا کرتے ہیں، لیکن شوق مہمان نوازی نے عجب وریا جیسے مہلک امراض بھی پیدا کر دیئے ہیں، اہل پورنیہ کے شوق مہمان نوازی کا اس امر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عام تقریبات کے علاوہ محض وعظ و پند کے لئے جو جلسے کرتے ہیں اور اس میں قرب وجوار کے سامعین جمع ہوتے ہیں تو بانیان جلسہ تمام سامعین کے لئے بھی دعوت کا سامان کرتے ہیں، اور بغیر کھانا کھلائے ان کو جانے نہیں دیتے، اس کے لئے ایک ایک جلسہ میں تین تین چار چار گائیں محض گوشت کے لئے ذبح کی جاتی ہیں، اگر کھانے کا وقت نہ بھی ہو تو وہ باصرار کھلائیں گے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارے گاؤں میں آئے اور بغیر کھانا کھائے چلے گئے، یہ کیسے ممکن ہے، ایک روز میں نے دیکھا کہ مغرب کے قریب نماز کے لئے جلسہ برخواست کیا گیا، ایک طرف اذان ہوئی اور دوسری طرف سامعین کیلئے

دستر خوان بچھایا گیا، لوگ جماعت میں شریک ہونا چاہتے ہیں، مگر کھلانے والوں کا اصرار ہے کہ پہلے کھانا کھالو کیوں کہ ان کو اندیشہ تھا بعد نماز سب لوگ چلے جائیں گے اور کھانا نہیں کھائیں گے آخر میں نے اس وقت کچھ زجر سے کام لیا اور نماز ہوئی اور کچھ لوگ جو کھانے کے لئے بیٹھ گئے تھے، جلد جلد چند لقمہ کھا کر نماز میں شریک ہوئے، مجھ کو جب اس طریقہ کے بہت سے مضر اثرات محسوس ہوئے تو میں نے اس روش کی اصلاح کی سعی کی اور الحمد للہ چند جگہوں میں یہ طریقہ بند کیا گیا، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ طریقہ پندرہ بیس سال سے رائج ہے، اور ابھی تک تمام ضلع میں یہ بات نہیں پھیلی ہے، اس سے میں بہت خوش ہوا کہ خیر چند ہی تھانوں میں یہ طریقہ مروج ہے، اس لئے اصلاح میں انشاء اللہ تعالیٰ دقت نہ ہوگی، اس جدید طریقۂ مہمان نوازی میں چند خرابیاں بہت زیادہ ہیں:

اول یہ کہ بلا ضرورت اور بے فائدہ بہت سا روپیہ برباد ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ اس باب میں پھر نام و نمود کا جذبہ اور شوق مسابقت مہلک ہے، ایک گاؤں والا دوسرے گاؤں والے سے بڑھنا چاہتا ہے، یہ کوشش ہوتی ہے کہ اگر وہاں دو گائیں ذبح کی گئی ہیں تو ہمارے یہاں تین گائیں ذبح کی جائیں ہم نے وہیں سنا کہ ایک ایک روز بعض گاؤں میں سات سات گائیں سامعین کی ضیافت کے لئے ذبح ہوئیں، جس کا کوئی فائدہ نہیں، ہاں اگر ضرورت ہو، مثلاً جو لوگ مکان واپس نہ جا سکتے ہیں تو بیشک ان لوگوں کے لئے کھانے کا سامان کرنا ایک

اسلامی اور اخلاقی فرض ہے، اس کے ماسوا محض جشن اور نام و نمود کے لئے جو کچھ کیا جاتا ہے اس کو بالکل ترک کرنا چاہئے، اور جو روپیہ اس طرح پر ضائع کئے جاتے ہیں اس کو اپنی دیگر ضرورتوں یا قومی و مذہبی کاموں کے لئے محفوظ رکھا جائے تو بہت ہی بہتر ہے۔

عقدِ بیوگان:

خدا کا شکر ہے کہ اس ضلع میں عموماً عقد بیوگان رائج ہے اور ہر طبقہ کے مسلمان اس سنت پر عمل کرتے ہیں، ضلع پٹنہ کی طرح وہاں کے شرفاء اس کو شرافت کے خلاف نہیں سمجھتے، اس ضلع میں صرف ایک گاؤں ایسا نظر آیا کہ جہاں عقد بیوگان آج تک شرافت کے خلاف سمجھا جاتا ہے اور آج تک ایک بیوہ کا بھی عقد نہیں ہوا، اس بستی میں بھی ہم لوگ گئے، یہ بستی اپنے اندر بہت سی خصوصیات رکھتی ہے، اس بستی کے لوگ بھی تقریباً سب کے سب مسلمان ہیں، دو پختہ مسجدیں ہیں، حالاں کہ پختہ مسجدیں ضلع پورنیہ کے گاؤں میں بہت کم ہیں، مگر یہاں ایک مسجد کے بعد دوسری مسجد اس سے تھوڑے فصل پر محض شان ریاست کے اظہار کے لئے بنائی گئی ہے، ورنہ کوئی ضرورت نہ تھی، یہاں کے رؤساء و غرباء سب ہی خوش اخلاق ہیں اور تقریباً سب ہی لوگ خوشحال۔ اگر ان میں بہت سی خوبیاں ہیں تو چند ایسے نقائص بھی ہیں جو اس ضلع میں اس بستی کی خصوصیات میں داخل ہیں۔

(۱) ایک وہی عقد بیوگان کا رائج نہ ہونا۔

(۲) دوم یہ کہ اس اس بستی کی تمام قرابت اسی بستی کے اندر محدود ہے یعنی آج تک بستی کے باہر کسی دوسرے گاؤں میں شادی بیاہ کا رواج نہیں ہے۔

(۳) سوم یہ کہ تمام گاؤں کے لوگ مشورہ کر کے شادیاں ایک ہی روز کرتے ہیں یعنی دس پندرہ سال تک تمام لڑکے لڑکیاں جو قابل شادی ہوتے ہیں، ان کی شادی رکی رہتی ہے، جب اسّی نوے، سو، سوا سو کے قریب عقد نکاح ہونے کا تخمینہ ہوا، تو ایک تاریخ مقرر کر کے ایک ہی دن سبھوں کا عقد پڑھایا جاتا ہے، چنانچہ اس سال ایک سو سے زائد عقد نکاح ایک ہی روز ہوئے۔

اس نظم کا نتیجہ یہ ہے کہ بالکل غیر مناسب العمر لڑکے اور لڑکیوں کا باہمی ازدواج ہوتا ہے جو نہایت ہی ناگفتہ بہ ہے، اس کے علاوہ شادیوں میں ناچ ورنگ اور اصراف بیجا بھی کسی طرح کم نہیں ہے، ان کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر اس گاؤں سے ان مراسم قبیحہ کے رفع کرنے کی بھی سعی کی گئی، ناچ ورنگ، ڈھول باجہ کے ترک کرنے کی بابت تو مولوی عبد الہادی صاحب نے ہماری موجودگی میں ان لوگوں سے عہد لیا اور بعد کو معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے شب کو ایک جلسہ مشورت کر کے یہ طے کر لیا کہ اس عہد کی پوری پابندی کی جائے۔ مجھ کو امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ کچھ دنوں کے اندر اس بستی میں بھی عقد بیوگان کا رواج ہو جائے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ اللہ پاک اپنی قدرت کاملہ سے ان کو مجبور

کر رہا ہے کہ وہ اول الذکر دونوں پابندیوں کو جلد از جلد توڑیں۔ کیوں کہ اب کچھ دنوں سے اس بستی میں عام روایت پیدا ہوگئی ہے کہ عورتیں وضع حمل کے بعد اکثر انتقال کر جاتی ہیں اور بچے بھی اب بہت زیادہ نقصان ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ عذاب الٰہی ہے جو اس صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

ما أصابكم من مصيبة فيما كسبت أيديكم

یعنی تم پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت ہیں۔ جب بیوہ عورتوں پر ظلم کیا جاتا ہے کہ عقد ثانی بہ جبر روکا جاتا ہے اور ۲۰۔۲۰ر برس کی کنواری لڑکیاں ۸۔۹ر برس کے لڑکوں کے ساتھ بیاہی جاتی ہیں تاکہ بستی کے باہر برادری نہ کرنی پڑے تو اللہ پاک نے یہ عذاب نازل کرنا شروع کر دیا، تاکہ کنواری لڑکی کے نہ ملنے کی وجہ سے بیوہ عورتوں سے شادی کرنے پر تم مجبور ہو جاؤ، اور بستی میں لڑکے یا لڑکیوں کے کم ہونے کے باعث دوسرے گاؤں میں منسوب کرنے لگو، اور اس طرح پر ایک ایک دن میں سو سو شادیوں کا رواج بھی متروک ہو جائے۔ پس اس گاؤں کے لوگوں کو چاہئے کہ اللہ پاک سے ڈریں اور جہاں تک ممکن ہو جلد از جلد ان مراسم قبیحہ سے توبہ کریں۔ ان مراسم کے ترک کرنے سے عزت اور جاہ میں کچھ کمی نہ ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہے گا۔

تعدّد ازدواج:

مسلمانان پورنیہ میں منجملہ اور باتوں کے ایک بات قابل فخر یہ ہے کہ ان میں تعدد ازدواج کا بھی رواج ہے اور بالکل جائز اور شرعی قاعدہ سے اکثر ذی حیثیت لوگ دو دو تین تین بیویاں رکھتے ہیں اور بظاہر عقد بیوگان و تعدد ازدواج کا رواج ہی پورنیہ ضلع میں مسلمانوں کی آبادی کو دن بدن بڑھا رہا ہے، ان دونوں امور کا رواج پانا ایک طرف اسلامی اخلاق کی حفاظت کے لئے نہایت مضبوط قلعہ ہے اور دوسری طرف سیاسی دنیا میں بھی اس کی قدر و قیمت ان دنوں بہت زیادہ ہے، اور تیسری طرف رسول اللہ ﷺ کی خوشنودی و مسرت کا ذریعہ ہے، جس سے آخرت میں بہترین ثمرات ملنے کی توقع ہے، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم لوگ ایسی عورتوں سے شادی کرو کہ جن سے اولاد پیدا ہو، کیوں کہ میں تمہاری کثرت تعداد کی وجہ سے قیامت میں دوسرے انبیاء کرام کی امتوں پر فخر کروں گا۔ گویا اس حدیث شریف میں یہ بتایا گیا کہ امت محمدیہ کی تعداد بڑھانے کی سعی کرو۔ اس لئے نہایت مبارک ہیں وہ لوگ جو جائز و شرعی طور پر امت محمدیہ کے بڑھانے کے ذرائع کو اختیار کرتے ہیں اور اس نعمت سے محروم القسمت ہیں وہ لوگ جو قدرت و صلاحیت رکھنے کے باوجود جائز طریقوں کا سد باب کرتے ہیں، دیگر اضلاع کے مسلمانوں کو ضلع پورنیہ کے مسلمانوں سے سبق لینا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ اگر مسلمانان بہار عموماً ان دونوں طریقوں پر

عمل شروع کردیں یعنی عقد بیوگاں، تعدد ازدواج تو بہت سے مفاسد کا سد باب ہو جائے اور شرافت و عزت میں کچھ فرق نہ آئے، اخلاق بھی خراب نہ ہوں، اور قلت تعداد کا جو رونا ہے ایک حد تک یہ غم بھی غلط ہو جائے۔

مستورات کی جفاکشی:

معاشرتی حیثیت سے ایک خوبی یہ بھی معلوم ہوئی کہ عموماً مستورات نہایت مستعدی کے ساتھ اپنے گھروں کے کام کاج میں لگی رہتی ہیں، صرف پکانا اور کھانا ان کا کام نہیں ہے، بلکہ ذریعۂ معاش کی تحصیل و حفاظت میں وہ مردوں کی سہیم و شریک رہتی ہیں، پلنگ یا تخت پر بیٹھ کر پان کی گلوریاں بنانا ان کا شیوہ نہیں ہے، یہ احوال صرف غریب گھرانوں کے نہیں ہیں، بلکہ خوشحال گھرانوں کا بھی یہی حال ہے، الغرض پورنیہ کی عورتیں کاہل و سست اور آرام طلب نہیں ہیں، بلکہ محنت و مشقت کی عادی ہیں، اس لئے ان کی صحت بھی اس طرف کی عورتوں کے اعتبار سے اچھی ہے، ہمارے نزدیک مستورات کی یہ صفت شرعاً و عقلاً قابل تعریف ہے، اور اس قابل ہے کہ دیگر اضلاع کی مستورات اس صفت میں ان کی تقلید کریں، لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ کام کاج میں شرعی پردہ کو جو غیر ضروری قرار دیا گیا ہے اس کو روکنا چاہئے اور باہر نکلنے کے وقت ہر مسلمان عورت کو برقعہ پوش ہونا چاہئے، اس بے پردگی کے ذمہ دار خود مرد ہیں، اگر وہ برقعہ کیلئے کپڑہ دیں تو عورتوں کو برقعہ اوڑھنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔

زراعت:

یہ تو تمام لوگوں کو معلوم ہے کہ ضلع پورنیہ کے مسلمان زیادہ تر کاشتکار ہیں، جس طرح دیگر اضلاع میں بھی ابھی تک تھوڑے مسلمان کاشتکار ہیں، بیس سال پہلے آج کی نسبت سے ان اضلاع میں بھی زیادہ کاشتکار تھے، مگر اب روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں، کیوں کہ مسلمانوں کی زمینیں فضول خرچی اور آرام طلبی کے باعث ہندوؤں کے ہاتھوں میں جارہی ہیں، لیکن پورنیہ ضلع کے مسلمان بفضلہٖ تعالیٰ ابھی تک اس آفت سے محفوظ ہیں اور انہوں نے اب تک اپنی زمینوں کو ہندوؤں کے ہاتھوں میں جانے سے بچایا ہے، یہی وجہ ہے کہ پریشان روزگار اس ضلع میں بہت کم ہیں، اکثر لوگ خوشحال ہیں۔ لیکن ایک عیب ان میں نہایت سخت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنی زمینوں سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی سعی نہیں کرتے، دیگر اضلاع کے کاشتکار جتنی محنت کرتے ہیں اگر وہ بھی اسی قدر محنت کریں تو ہر کاشتکار و زمیندار کا تمول دوگنا اور سہ گنا ہو جائے، اکثر زمینیں غیر مزروعہ رہ جاتی ہیں، اس کیلئے ان کا عذر یہ ہے کہ مزدوروں کی قلت ہے اور مزدوری روز بروز بڑھ رہی ہے، لیکن یہ عذر صحیح نہیں ہے مزدوری یقیناً بڑھے گی اور مزدور کوشش کرنے سے دستیاب ہو سکتے ہیں، یہ کون سی دانائی ہے کہ اضافہ مزدوری کے خیال سے ہم اس فائدہ سے ہاتھ دھو بیٹھیں جو ہم کو کچھ مزید خرچ کرنے سے پہنچ سکتا ہو اور ایک دوسری غلطی یہ ہے کہ وہاں روپۓ اور کھیت

میں زراعت لگانے کے بعد کھیت سینچنے کا دستور نہیں ہے، صرف آسمانی بارش اور زمین کی نرمی پر ان کی زراعت کا دار و مدار ہے، زراعت نقصان ہو رہی ہے اور پانی تالاب وغیرہ میں موجود ہو تو وہ لوگ تالاب سے زراعت کو سیراب نہیں کریں گے وہ کرنگ، لاٹھا، کونڈی، چانڑ وغیرہ کا استعمال جانتے بھی نہیں، حالاں کہ میں نے بہت سے کھیتوں کو دیکھا کہ اگر ایک پانی سے سینچ دیا جاتا تو یقیناً زراعت بہت بہتر ہوتی۔

مسلمانان ضلع پورنیہ کو چاہئے کہ وہ اس طرف بھی توجہ کریں اور اپنی زمینوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ ان کے اس استغناء و بے نیازی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ زمینوں کا لگان بہت ہی کم ہے، بہت سی زمینوں کا لگان ۴ر آنہ اور ۸ر آنہ بگہہ ہے اور زیادہ سے زیادہ لگان ایک روپیہ اور دو روپیہ بگہہ تک ہے، اس لئے غیر مزروعہ رہنے اور قلت پیداوار کی صورت میں کچھ اپنا نقصان محسوس نہیں کرتے، حالاں کہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ نفع کم حاصل ہونا یہی نقصان ہے۔

تربیت گاؤ:

ضلع پورنیہ کے مسلمانوں میں بالخصوص کاشتکاروں میں بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ گائیں و بھینسیں بھی بہت وافر طریقہ پر پالتے ہیں، جس کا ثمرہ یہ ہے کہ دودھ، گھی میں وہ کسی دوسرے کے محتاج نہیں ہیں، زراعت کے لئے بیل بھی

کم خریدنے پڑتے ہیں، قربانی کے لئے گائیں بھی کسی غیر سے ان کو خریدنی نہیں پڑتیں، بلکہ دیگر تقریبات میں بھی اکثر وہ خود اپنے گھر ہی کی گائیں ذبح کرتے ہیں۔ مویشی کی تربیت مسلمانوں میں عموماً متروک ہوتی جاتی ہے۔ ضلع پٹنہ، گیا، آرہ، مونگیر، بھاگلپور وغیرہ میں تو تقریباً متروک ہے۔ بہت ہی کم کاشتکار ہیں جو گائے و بھینس پرورش کے لئے رکھتے ہیں۔ پورنیہ کے بعد اضلاع ترہت میں بیشک کسی قدر ابھی تک تربیت گاؤ کا دستور ہے۔ صوبۂ بہار کے تمام اضلاع کے کاشتکاروں کو مسلمانان پورنیہ کی اس باب میں تقلید کرنی چاہئے۔ ہر کاشتکار جو ایک ہل کی کاشت کرتا ہو اگر وہ کم از کم گائیوں کی تربیت کا التزام کرلیں تو چند سالوں میں وہ بہت ہی فائدہ میں رہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قربانی کے لئے جو دوسروں سے گائے خریدنی پڑتی ہے اور اس کی وجہ سے اکثر فتنہ وفساد بھی ہوتا رہتا ہے، ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔ ہم مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ اس کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ جلد از جلد گائیں پالنا شروع کردیں۔ انشاء اللہ وہ بہت ہی نفع میں رہیں گے، کاشتکاروں کیلئے کوئی دقت نہیں ہے یہ ضروری نہیں کہ بڑی قیمتی گائیں ہوں، چھوٹی چھوٹی گائیں بھی بہت ہی مفید ہیں۔

تعلیم :

اہل پورنیہ میں معاشرتی ومذہبی حیثیت سے جو کچھ نقائص ہیں زیادہ تر اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تعلیمی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہے، سرکاری رپورٹ کے اعتبار سے تقریباً تین فی صدی تعلیم یافتہ ہیں یعنی کچھ لکھنا وپڑھنا جانتے ہیں، لیکن میرے خیال میں ان تعلیم یافتوں میں ان لوگوں کو بھی شامل کرلیا گیا ہے جو ہندی میں دستخط وغیرہ کرسکتے ہیں ورنہ اردو لکھے پڑھے تو اس سے بھی کم نظر آئے۔ اور انگریزی داں مسلمان تو اس ضلع میں بمنزلہ صفر ہیں اور مصیبت یہ ہے کہ عموماً تعلیم کی طرف رغبت بھی نہیں ہے، بعض ذمہ دار لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ اردو سے تو ان کو ایک گونہ نفرت ہے، خیال یہ ہے کہ لڑکا ہندی جان لے گا تو پٹواری گری کرے گا اور کچہریوں میں تو اسی کی ضرورت ہے اردو جاننے سے کیا حاصل۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو نہایت ہی تباہ کن خیال ہے گویا تعلیم کا یہ ہی ایک مقصد قرار دیا گیا ہے کہ چند ٹکے اس کے ذریعہ سے حاصل کئے جائیں اور بس، اگر تعلیم کا یہ ہی ایک مقصد ہو تو پھر تعلیم کی اس سے بڑھ کر اور کوئی توہین نہیں ہوسکتی ہے، اس لئے یہ خیال سراپا غلط ہے، کیوں کہ تعلیم کا اصل مقصد تہذیب

نفس اور خدا شناسی ہے، اس کے بعد صنعت علم کے ذریعہ جو کچھ حاصل ہو جائے وہ ضمنی فوائد ہیں۔

رس جونکہ

اردو زبان میں اکثر فنون کا اس قدر ذخیرہ جمع ہو گیا ہے کہ صرف اچھی طرح اردو سمجھنے اور پڑھنے کی اگر صلاحیت پیدا ہو جائے تو گھر بیٹھے ہر مسلمان عقائد، معاملات اور اخلاق کے مسائل کا عالم اور اپنی اسلامی تاریخ کا مورخ بن سکتا ہے، اس لئے اردو کی تعلیم تو ہر مسلمان کے لئے ناگزیر ہے۔

بہر حال یوں تو تعلیم کی ہر جگہ قلت ہے لیکن پورنیہ کی حالت اس باب میں سب سے زیادہ قابل افسوس ہے، اس میں شک نہیں کہ جابجا مدارس بھی جاری ہیں، مگر ان مدارس سے زیادہ فائدہ متصور نہیں ہے، کیوں کہ جہاں مدرسہ قائم ہوتا ہے تو اس کے منتظمین اور مدرسین کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہر مدرسہ گویا ایک جامعہ کلیہ ہو اور اقل درجہ یہ ہے کہ عربی کی تعلیم دی جائے اور علماء پیدا کئے جائیں، بے شک خیال تو نہایت مبارک ہے، مگر یہ عملاً نا ممکن ہے اور اصلی مرض کا علاج نہیں ہے، بلکہ ضرورت یہ ہے کہ دیہات و قصبات میں چھوٹے چھوٹے مکاتب ہوں جہاں صرف کلام مجید اور بذریعہ اردو دینیات کی تعلیم دی جائے تاکہ معمولی لکھنا پڑھنا آجائے، اگر کوئی لڑکا اس سے زائد تعلیم حاصل کرنا چاہے تو پھر اس کے لئے صدر مقامات کے مدارس کے دروازے کھلے ہوئے

ہیں، مجھے افسوس ہے کہ ہمارے علماء کرام وزعمائے ملت ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کرتے جو سب سے زیادہ قابل توجہ چیز ہے اکثر صحبتوں میں میں نے اپنے خیالات اس باب میں ظاہر کیے ہیں اور انشاء اللہ کسی فرصت میں اب اس مسئلہ پر مستقل مضمون لکھوں گا، اس وقت صرف اس قدر گذراش ہے کہ تعلیم دین جو فرض عین ہے، اس کے حصول کا ذریعہ صرف کتابی تعلیم نہیں ہے اور یہ فرض صرف کتابی تعلیم سے ادا بھی نہیں ہو سکتا، بلکہ سب سے اول زبانی تعلیم کی حاجت ہے، کیوں کہ تعلیم کے عام ہونے کی یہی صورت ہے، اس کے بعد کتابی تعلیم ہونی چاہئے۔

اس لئے ابتداءً بچوں کو بھی زبانی تعلیم دینی چاہئے اور پانچ چھ ماہ زبانی تعلیم دینے کے بعد کتابی تعلیم شروع کی جائے اور بڑے بوڑھوں کو تو عموماً صرف زبانی ہی تعلیم دینی ممکن ہے۔ جس قدر بھی وقت میسر آئے، اس کے اندر ان کو عقائد، عبادات اور اخلاقی مسائل کی تعلیم دی جائے۔ مذہبی و قومی روایات یاد کرائے جائیں، مگر ہم لوگوں نے تعلیم کے اصلی طریقوں کو اختیار نہیں کیا، حالانکہ خیر القرون کے زمانہ میں تعلیم کے یہی طریقے مروج تھے۔ اس لئے اس عام جہالت کی ذمہ داری صرف عوام الناس پر نہیں ہے، بلکہ سب سے زائد اس کی ذمہ داری ہماری قوم کے رہبروں، بالخصوص ہمارے علماء کرام پر ہے۔ ہمیں معاف کیا جائے تو ہم عرض کریں گے کہ ہم نے اپنی زندگی کا مقصد زائد

سے زائد یہ بنالیا ہے کہ کچھ لوگوں کو ہم عالم دین بنادیں۔ مگر افسوس کہ ہم اس مقصد میں بھی اب حقیقۃً ناکام ہورہے ہیں، اگر اہل پورنیہ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں، ایک مسلمان دوسرے کے گھروں میں بلا تکلف آگ لگاتا ہے، ڈاکہ مارتا ہے اور سود خوری وبائے عام کی طرح مسلط ہے، معمولی معمولی مسائل سے بھی ناواقف ہیں، توان عیوب کی کثرت میں عام جہالت کو بھی بہت زیادہ دخل ہے اور اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ مقامی علماء کے علاوہ ان مولویوں اور پیروں پر سب سے زیادہ ذمہ داری ہے جو ہمیشہ پورنیہ ضلع کے گاؤں گاؤں میں دورہ کیا کرتے ہیں۔

صلاحیت قبول حق:

میں نے مسلمانان ضلع پورنیہ کے طبائع کا جو اندازہ کیا تو مجھے محسوس طور پر معلوم ہوا کہ ان میں قبول حق کی بہترین صلاحیت ہے، اگر ان کی نفسیات کا لحاظ کر کے کام کیا جائے تو مجھے امید ہے کہ دس سال کے عرصہ میں ہر حیثیت سے ضلع پورنیہ اسلامی آبادی کا بہترین خطہ ہو سکتا ہے اور اس کے اکثر عیوب محاسن کے مبدل ہو سکتے ہیں، اس سلسلہ میں ایک دو واقعہ کا ذکر غالباً مفید ہوگا۔ ہم لوگ ایک ایسے گاؤں میں پہونچے کہ جہاں برابر علماء کرام و پیران طریقت جایا کرتے ہیں بلکہ ہر سال ایک شاندار جلسۂ وعظ منعقد ہوا کرتا ہے ہزاروں مسلمان ہمیشہ شریک جلسۂ وعظ ہوتے ہیں، ہم لوگ پہلی مرتبہ وہاں پہونچے،

نماز کے وقت جلسہ گاہ میں اذان دی گئی اور جماعت کے لئے صف بندی شروع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ہر چار طرف کثرت سے لوگ تیمّم کر رہے ہیں، حالانکہ ان کو کوئی عذر نہ تھا، میں نے چند منٹ توقف کر کے وضو و تیمّم کے احکام بتائے وہ لوگ فوراً وضو کے لئے قریب کے تالاب کی طرف دوڑ پڑے اور پھر جماعت میں شریک ہوئے، امامت ہم مسافروں ہی میں سے ایک صاحب نے کی اور حسب اصول نماز شروع ہونے سے پہلے نماز قصر پڑھنے کا اعلان کر دیا گیا، مگر بعد سلام میں نے دیکھا کہ تقریباً تین چوتھائی نمازی جو مقیم تھے، انہوں نے بھی سلام پھیر دیا، اشارہ کرنے پر بعض لوگ کھڑے ہوئے تو دوبارہ تکبیر تحریمہ کر کے ہاتھ باندھ رہے تھے۔ اور بہت سے لوگ تو سلام پھیر کر بیٹھے رہ گئے، آخر ہم لوگوں نے اس نماز کے ادا کرنے کے طریقے بتائے حالانکہ یہ وہ جگہ تھی جہاں ان کو برابر مسافرین کے پیچھے نماز پڑھنے کے مواقع یقیناً پیش آتے ہوں گے۔

ان کی ان حالتوں کو دیکھ کر خیال ہوا کہ نماز کوئی مقیم پڑھائے تو بہتر ہو، مگر پھر ان کی تعلیم اور مشق کا لحاظ کر کے ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ نماز مسافر ہی پڑھائے اور ہر وقت نماز قصر کے ادا کرنے کا طریقہ خصوصیت کے ساتھ بتادیا جائے چوں کہ تین دن وہاں قیام رہا ہم نے دیکھا کہ الحمد للہ اکثر لوگ جو برابر موجود رہے نماز کے احکام سے واقف ہو گئے، ان لوگوں نے بیان کیا کہ ہم لوگوں کو مسائل بتائے نہ جائیں تو ہم لوگ کیا کریں، اس قسم کے مواقع دیگر جگہوں میں

بھی پیش آئے اور پورے سفر میں ان احکام کی عملی تعلیم کا خیال رکھا گیا، جو بہت ہی مفید ثابت ہوا، شادی و دیگر تقریبات میں جو عموماً مسرفانہ مصارف ہوتے ہیں اور بہت سے ناجائز مراسم مروج ہیں۔ پورنیہ ضلع میں بھی اس کی کثرت ہے، بلکہ کچھ زائد۔ اس کی اصلاح کی طرف ہمارے جانے سے پہلے جناب شاہ محمد عبدالحلیم صاحب قبلہ نے توجہ کی اور ہم نے دیکھا کہ آٹھ دس گاؤں کے مسلمانوں نے اس اصلاح کو بخوشی قبول کیا، ان گاؤں کے مسلمان خود ہم سے ملے اور دو تین روز تک وہ لوگ ہم سے ملتے رہے۔ میں نے بھی ضروری ترمیم کے ساتھ ان کی اصلاح کی تائید کی جس سے وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔ حالاں کہ ان میں سے بہت سے لوگ جناب شاہ عبدالحلیم صاحب قبلہ کے مرید ہیں۔ مگر وہ لوگ بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے امارت شرعیہ کے شرعی احکام سے سر تابی کو گناہ سمجھتے ہیں اور خود ان کے پیر و مرشد بھی نہایت سلیم الطبع بزرگ ہیں۔ مجھ کو ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ انہوں نے قبل ہی سے مریدوں کو تاکید کی ہے کہ امارت شرعیہ کی اتباع شرعاً واجب ہے جو احکام آئیں ان پر عمل کرو۔ مقصود اصل اس بیان سے یہ تھا کہ شادیات کے مراسم کو لوگ عموماً بمشکل چھوڑتے ہیں، لیکن ان لوگوں نے نہایت سہولت سے اس اصلاح کو قبول کیا، مضمون کے طویل ہونے کا خوف نہ ہوتا تو میں ان مراسم کو بیان کرتا جو وہاں مروج ہیں اور پھر لکھتا کہ کس طرح ان لوگوں نے اصلاحات کو قبول کیا۔

میں نے ان بھائیوں کو اور اپنے نقباء کو تاکید کی ہے کہ وہ بھی اسی اصول سے تقریبات انجام دینے کی سعی کریں۔ ایک تیسرا واقعہ یہ ہے کہ سب ڈویژن اررِیہ میں بہت سے ایسے مسلمان تھے جو شراب پیتے تھے۔ تنظیم امارت کے بعد وہاں کے نقباء نے اصلاح کی کوشش کی تو سوائے تین چار کے سب نے توبہ کی۔ اس مرتبہ خود مقامی لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم لوگوں نے حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں چار ہزار روپیہ مسلمانوں کے شراب خانوں میں جانے سے بچ گئے۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب مبلغ ضلع پورنیہ کے رپورٹ سے پہلے یہ بات معلوم ہوئی۔ وہاں جانے پر اس کی مزید تصدیق ہوئی الغرض ان چند واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اہل پورنیہ میں کس قدر صلاحیت ہے، اگر ہم کو بہتر کارکن ملتے گئے تو انشاءاللہ تعالیٰ پورنیہ ضلع بہت جلد اصلاح پذیر ہوگا اور اس کی اصلاح کے بعد اس کے ذریعہ بڑی بڑی اسلامی خدمتیں انجام پا سکتی ہیں۔

ایک خاص اسلامی خصوصیت:

اس ضلع کے گاؤں میں جو ایک خاص اسلامی خصوصیت نظر آئی جس کے لئے آنکھیں بے تاب تھیں اور ہمیشہ اس کے لئے میں تمنا ہی کرتا رہا، اور شاید یہ تمنا ہندوستان میں کسی اور جگہ پوری ہی نہ ہونے پائے، وہ یہ ہے کہ اسلامی تمدن کا اصول یہ ہے کہ مسلمانوں کی آبادی غیر مسلموں کی آبادی سے علیحدہ ہو، نار کفر و نور اسلام باہمی متصل نہ رہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں ان

مسلمانوں سے بیزار ہوں جو مشرکین کے درمیان سکونت اختیار کرتے ہیں۔ اس حدیث شریف کی چاہے لوگ کچھ بھی تاویل کریں، مگر آنحضرت ﷺ کا منشاء یہ ہے کہ مسلمانوں کے مکانات کفاروں کے مکانات سے علیحدہ ہوں۔ ان کی آبادی کافروں کے ساتھ ملی جلی نہ رہے۔ اس حکم میں بہت سے مصالح ملّی مضمر ہیں، مگر بد قسمتی سے عموماً اس ارشاد گرامی پر عمل متروک ہے۔ جس کے نتائج بد ہر روز ہماری آنکھوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، اور پست ہمتی سے ہر جگہ اس کی اصلاح بھی مشکل ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اہل پورنیہ عموماً اس بات میں ہم تمام لوگوں سے زیادہ عقلمند اور ہوشیار ثابت ہوئے بلکہ سچ یہ ہے کہ اس باب میں وہ ہم تمام لوگوں سے بہترین مسلمان ثابت ہوئے، کیوں کہ مسلمانوں کی آبادی غیر مسلموں سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے۔

اگر ایک گاؤں میں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں رہتی ہیں تو دونوں کے ٹولے علیحدہ علیحدہ بہت زیادہ فصل سے ہوتے ہیں گویا دو گاؤں معلوم ہوتے ہیں، چاہے اس کے اسباب کچھ بھی ہوں لیکن یہ ایک ایسی بات ہے جو اسلامی اصول کے مطابق ہے۔ اس لئے اس پر اہل پورنیہ جس قدر بھی فخر کریں کم ہے اور مجھ کو امید ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی اس شان کو قائم رکھیں گے۔ اگر کسی جگہ اس کے خلاف ہو (جس کو میں نے نہیں دیکھا ہے) تو وہاں بھی اسی اصول پر آباد ہو جائیں تو بہت ہی بہتر ہے۔ اگرچہ ابھی بہت سے ہمارے تأثرات باقی ہیں۔ مگر آج میں اس

سلسلہ کو اسی جگہ ختم کرتا ہوں کیوں کہ اس کی وجہ سے بہت سے دیگر ضروری مضامین کے لئے جریدہ میں جگہ باقی نہیں رہتی ہے، لیکن آخر میں ہم اپنے پورنیہ کے بھائیوں سے اُس قدر عرض کرتے ہیں کہ آپ کے محاسن کے ساتھ آپ کے عیوب کا اظہار محض محبت واخلاص پر مبنی ہے تاکہ آپ اس کی اصلاح کر لیں اور اگر دیگر جگہوں میں اس قسم کے عیوب ہوں تو وہاں بھی اصلاح کی کوشش کی جائے، پس آپ کی وملت اسلامیہ کی خیر خواہی مقصود ہے کہ "الدين النصيحة" نہ یہ کہ عیوب کی تشہیر، اسی لئے کسی گاؤں یا شخص کا نام عیوب کے سلسلہ میں ظاہر نہیں کیا گیا، کیوں کہ اس کی حاجت نہیں تھی، جریدہ امارت ہر جگہ جاتا ہے جہاں کی جو بات ہے وہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں گے اور اصلاح کی کوشش کریں گے۔

والله يوفقكم لما يحب و يرضىٰ

وما لأحد عنده من نعمة تجزىٰ إلا ابتغاء وجه ربه الأعلىٰ ولسوف يرضى۔

نشہ خوری سے اجتناب فرض ہے

میرے پیارے بھائیو!

میں آپ کو ایک پیام پہنچاتا ہوں۔۔ خدا کی مخلوق میں خدا کے بعد سب سے بڑا اور اونچا انسان بنایا گیا ہے، اور دنیا کی سب سے بڑی اور اونچی چیز عقل (گیان) خدا کی مخلوق میں خدا کے بعد انسان ہی کو ملی ہے۔

تم اس بات کو سوچو، اور خوب سوچو کہ عقل (گیان) کے سوا تمہارے پاس کوئی چیز ایسی ہے جو دوسری مخلوق میں نہ ہو، میں یقین کرتا ہوں کہ تمہارا سوچ وبچار تم کو اس کے سمجھنے اور کہنے پر مجبور کردے گا کہ عقل (گیان) کے علاوہ انسان جو جو کچھ اپنے پاس رکھتا ہے، غیر انسان کے پاس ایک ایک کر کے وہ سب چیزیں پائی جاتی ہیں اور محض پائی نہیں جاتی ہیں بلکہ انسان سے بہتر اور برتر شکل میں پائی جاتی ہیں۔

غور کرو! تمہاری آنکھ سے ہرن کی آنکھ اچھی ہے، تمہارے کان سے ہاتھی کا کان بڑا ہے، تمہارے دانت سے درندوں کے دانت تیز ہیں، تمہارے بازو سے شیر کا بازو قوی ہے، تمہارے پاؤں سے اونٹ کا پاؤں زیادہ لمبا ہے، تمہارے سر سے بیوقوف گدھے کا سر زیادہ بڑا ہے، اسی طرح سے ایک ایک چیز کو اپنے سامنے

رکھو اور اپنے غیر سے اپنا جائزہ لو تو تم تھک کر اس نتیجہ پر پہنچو گے کہ انسان خدا کی مخلوق میں خدا کے بعد جو سب سے بڑا اور اونچا ہے وہ محض ''عقل'' (گیان) کی وجہ سے ہے جو دنیا کی سب سے بڑی اور اونچی چیز ہے اور خدا کی مخلوق میں خدا کے بعد انسان ہی کو ملی ہے۔

لہذا انسان کیلئے سب سے بُری اور کمینہ چیز جو ہو سکتی ہے وہ وہی چیز ہو گی جو انسان کی عقل (گیان) کو برباد کر دے اور وہ نشہ کی چیز ہے چاہے شراب ہو یا تاڑی یا اس قسم کی دوسری چیزیں، انسان کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انسان کے اصلی جوہر کو جس کی وجہ سے انسان انسان ہے، اس کو برباد ہونے سے بچایا جائے، لہذا حکومت کی یہ اسکیم کہ نشہ کی دوکانیں بند کر دی جائیں اور انسان کو اس ناپاک چیز کے استعمال سے روکا جائے، انسان کی سب سے بڑی خدمت ہے جس میں ہر شخص کو مدد کرنی چاہئے اور اس کو خوشی کے ساتھ خوش آمدید کہنا چاہئے۔

میرے پیارے بھائیو!

مسکرات (یعنی نشہ کی چیزیں) جس طرح عقل کی رو سے سب سے بدترین اور انسانیت کو برباد کر دینے والی چیزیں ہیں، مذہب کے رو سے بھی یہ سب سے بُری چیز ہے اور تقریباً ہر مذہب نے اس کو بُرا کہا ہے، اسلام نے تو اس کا نام ہی ''ام الخبائث'' (برائیوں کی جڑ) رکھا ہے جس سے ہزاروں قسم کی بُرائیوں

کی شاخ پھوٹتی ہیں اور پھیلتی ہیں اور اپنے پھول اور پھل سے انسان کی بربادی اور ہلاکت کا سبب بنتی ہیں اور اسی سبب سے اسلام میں یہ حکم ہے کہ ہر نشہ کی چیز حرام ہے اور جس چیز کی کثیر اور زیادہ مقدار نشہ لاتی ہے اس کی قلیل اور تھوڑی مقدار چاہے وہ ایک گلاس ہو یا ایک قطرہ، حرام ہے۔ اور اس کا پینے والا گنہگار ہے۔

حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں۔۔۔ ایک وفد آیا تھا، انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں ویلم حمیری کے ذریعہ یہ عرضداشت پیش کی تھی کہ یارسول اللہ ﷺ ہم لوگ سرد ملک کے رہنے والے ہیں، سخت کام کرنے پڑتے ہیں، ہم لوگ گیہوں کی شراب بناتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ قوت حاصل کریں اور سردی پر بھی قابو پائیں، حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا یہ نشہ لاتی ہے؟ جواب دیا گیا کہ ہاں، نشہ لاتی ہے اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اس سے احتراز کرو، اس پر ویلم حمیری نے کہا کہ حضورؐ لوگ شراب کو چھوڑیں گے نہیں، تو آپؐ نے فرمایا ایسے لوگوں سے جنگ کرو، اسلام میں اس کے بارے میں اس کی بُرائی اور خبائث کی وجہ سے بہت سخت احکام ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ جو ایک دفعہ شراب پیتا ہے، اس کی چالیس وقت کی نماز قبول نہیں ہوتی ہے، (ترمذی) دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے شرابیوں کے لئے جو شراب سازی کرے اس کے لئے جنت کو حرام قرار دیا ہے (نسائی) ایک اور حدیث میں ہے کہ طارق بن سوید

نے شراب کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے پوچھا تو آپ نے منع فرمایا، اس پر طارق نے کہا کہ حضورؐ میں دوا کے لئے بناتا ہوں اس پر آپؐ نے فرمایا کہ شراب دوا نہیں ہے بلکہ بیماری ہے (مسلم وغیرہ وغیرہ۔

میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا ہوں ورنہ اسکے متعلق اسلام میں اس قدر وعید اور سخت احکام ہیں جن کو ایک جلسہ میں بیان بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے میں اپنے پیام کو ختم کرتے ہوئے آپ سے یہ استدعاء کرتا ہوں کہ اس ناپاک چیز سے اپنی پاک روح اور پاک آتما کو نجس نہ کریں اور اس دل کو جو مسلمانوں کے نزدیک خدا کا نشیمن ہے اور ہندو بھائیوں کے نزدیک پرماتما کا مندر ہے اس کو اس بدترین نجس چیز سے گھناؤنا نہ بنائیں۔

میں حکومت بہار کو اس اقدام پر مبارک باد دیتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کوشش میں کامیاب بنائے اور ملک و قوم کے لئے اس کو فلاح و بہبودی کا سبب بنائے۔

تحریک تبرا

کسی شخص یا فرقہ کے مقتدا اور محترم بزرگوں کو سب و شتم کرنا یا ان کی توہین و تذلیل کرنا، عقل، دانش کی روشنی میں انسانیت اور شرافت کی عدالت میں بدترین جرم ہے جس کا اعتراف و اقرار اس انسان کو بھی ہے جو نہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل ہے نہ رسالت کا اور نہ قیامت کا قائل ہے اور نہ آخرت کے جزا و سزا کا۔

اور اسلام نے تو اپنے حلقہ بگوشوں کو اس باب میں احتیاط کی یہاں تک تاکید فرمائی ہے کہ "مشرکین اور بت پرستوں کے دیوتاؤں تک کو برا نہ کہو، کیوں کہ آخر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مشرکین ضد و جہالت کے سبب سے اللہ تعالیٰ کو بھی (نعوذ باللہ تعالیٰ) گالی دینے لگیں گے جس کا انجام یہ ہو سکتا ہے کہ ناحق قتل و خوں ریزی و غارت گری کی نوبت آجائے اور بغیر کسی مفید نتیجہ کے امن عامہ میں خلل عظیم واقع ہوگا اور چوں کہ یہ حکم قرآنی ہے، اس لئے مسلمانوں میں کوئی شخص یا گروہ ایسا شامل ہو ہی نہیں سکتا جو باطل پرستوں کے بھی بزرگوں کے سب و شتم کے جواز کا قائل ہو کیوں کہ نص قرآنی(۱) کا منکر کافر ہی ہو سکتا ہے مسلم و مومن تو نہیں ہو سکتا۔

---

(۱) ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم (سورۃ الانعام/۱۰۸)۔

پھر خلفائے راشدین اور صحابہ کرامؓ جن کی جلالت شان اور ایمان واخلاص فی دین اللہ پر کلام کی سیکڑوں آیات بینا شاہد ہیں، اگر کوئی بد نصیب انسان ان کی شان میں گستاخانہ کلمات کہتا ہے اور اس کو جائز سمجھتا ہے، وہ صریح کفر کا مرتکب ہے یہ وہ مسئلہ ہے جس کو ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس کو ذرہ برابر بھی قرآن کریم سے لگاؤ ہے اور اس کے دل و دماغ میں کچھ بھی شعور و حس باقی ہے۔

اس لئے یہ امر تو بالکل ظاہر ہے کہ جو شخص یا جو گروہ خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سب و شتم کے جواز کا بھی قائل ہو اس کے لئے اسلام کا وسیع دامن باوجود اپنے انتہائی وسعت کے تنگ ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی ایسے شخص اور گروہ کو کسی طرح مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔

بس بنی آدم کا وہ فرقہ جو خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم یا دیگر صحابہؓ کو سب و شتم اور لعنت کرتا ہے (نعوذ باللہ منہ) خذلہم اللہ وہ قطعاً مسلمان نہیں ہے، ایسے لوگوں کو مسلمان سمجھنا مسلمانوں میں شمار کرنا انتہائی ظلم ہے عدوان ہے، بربریت اور جہالت ہے، مذکور الصدر حقائق کو پیش نظر رکھ کر لکھنؤ کے جدید فتنہ کو جو تبرائی گروہ کی پیدا کردہ ہے، اس پر تمام مسلم جماعتوں عامہ مسلمین اور حکومت کو ٹھنڈے دل سے غور و خوض کر کے ایک آخری فیصلہ کر لینا چاہئے، حکومت یوپی چونکہ برطانوی قانون کے ماتحت ایک منظم حکومت ہے، اس کا اولین فریضہ ہے کہ وہ محض عقل و دانش اور قانون عدل وانصاف کے ماتحت

نہایت جرأت کے ساتھ یہ اعلان کردے کہ:

کسی شخص یا فرقہ کو اس امر کی کسی حال میں اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ کسی فرقہ یا گروہ کے مقتداو پیشوا کو برملا سب وشتم کرے یا کسی طرح ان کی اہانت کرے، شخصی آزادی کے وسیع دائرہ میں ایسا کوئی نقطہ نہیں ہو سکتا جہاں اس ملعون حرکت کی گنجائش ہو، اگر کوئی بد نصیب فرقہ یہ سمجھتا ہے سول نافرمانی کے ذریعہ کوئی انسان کش اور حیاسوز آزادی بھی حاصل کی جاسکتی ہے تو وہ مخبوط الحواس ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے دماغ کا علاج کرائے یا اپنے وجود سے ہند کی سرزمین کو پاک کردے، لاکھوں تبرائی جیل خانوں یں سڑ کر اور سولی کے تختوں پر لٹک کر بھی ایسی آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔

اگر حکومت یوپی اس قسم کا بہادرانہ اعلان جو بالکل حق وصداقت پر مبنی ہے کردے تو اعلان کے ساتھ ہی یہ فتنہ ختم ہو سکتا ہے، مگر مجھے معلوم ہے کہ برطانوی قانون کے ماتحت جو حکومت بھی قائم ہے اور ہوگی اس میں اس قدر جرأت نہیں ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ حق وصداقت کی راہ اختیار کرے وہ تو سچائی کی راہ اسی وقت اختیار کرتی ہے جب سچائی کے شیدائی اپنے جانوں کو جوکھوں میں ڈال کر میدان میں قدم رکھتے ہیں اور حق وصداقت کے نعروں سے حکومت کے ایوان میں زلزلہ کی صورت پیدا کرتے ہیں، تاہم حکومت یوپی کے موجودہ وزراء کی دانشمندی سے ابھی تک یہ توقع ہے کہ وہ کوئی مؤثر اقدام کے ذریعہ اس

فتنۂ عظیمہ کا خاتمہ کر دیں گے، اگر خدانخواستہ انہوں نے اس فتنہ کی نمائش اسی طرح کچھ دنوں تک باقی رکھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔

حکومت یوپی کی سہل انگاری پر عقل و دانش کی دنیا متحیر اور انگشت بدنداں ہے کہ وہ تبرائی فتنہ پروروں کو بھی دفعہ ۱۴۴ یا دفعہ ۱۰۷ ضابطہ فوجداری کے ماتحت معمولی سزا دلوا رہی ہے، حالانکہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ (الف) کے اور ۲۹۸ کے ماتحت بھی ان کو سخت سزائیں دینی چاہیے بلکہ وہ اس عظیم فتنہ کو ہمیشہ کے لئے دفن کرنے کے لئے تبرائیوں کے خلاف ایک سخت اورڈیننس بھی جاری کر سکتی ہے، اگر قانون حکومت ہند میں قیام امن کی خاطر گورنروں کو اورڈیننس کے اختیارات دیئے گئے ہیں تو اس کا استعمال اس وقت کیوں نہیں کیا جاتا، کیا اورڈیننس کے اختیارات صرف ملک کی آزادی کا گلا گھونٹنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔

بہرحال حکومت یوپی کا فریضہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے اور مدح صحابہ کی اجازت عام کو انتظامی حدود کے اندر باقی رکھتے ہوئے تبراء کو قانوناً پوری قوت سے ایک دم بند کر دے، ورنہ اندیشہ ہے کہ تبرائی آگ صرف تبرائیوں ہی کے گھروں کو جلا کر خاکستر نہ بنائے گی بلکہ اس کی لپک سے حکومت کے ایوانوں کی کرسیاں بھی شاید محفوظ نہ رہ سکیں گی۔

اسی کے ساتھ مجھے تمام مسلمانوں سے عموماً اور جمعیۃ علماء ہند اور مجلس

احرار اسلام کے رہنماؤں سے خصوصاً پر درد خواست ہے کہ لکھنؤ میں تبرائی فتنہ
نے جو سر اٹھایا ہے اگر حکومت یوپی نے اس کے کچل ڈالنے میں تاخیر کی تو پھر
جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام کو اس حیا سوز اور انسانیت کش تحریک کو ختم
کرنے اور اساطین اسلام کے ناموس کی حفاظت اور اسلام کی جلالت شان کو
بر قرار رکھنے کے لئے میدان عمل میں آنا چاہئے اور غور وخوض کے بعد مؤثر
اقدام کا فیصلہ کرنا چاہئے کیوں کہ ملک کی آزادی ہو یا غریبوں کی روٹی کا مسئلہ
یا مسلمانوں کے لئے ہندوستانی حکومت میں مناسب حصہ داری تہذیبی خود
مختاری یہ سب کا سب ایک ہی اصول اور مقصد کے ماتحت ہے کہ اللہ تعالیٰ
وتبارک کی رضامندی حاصل ہو احکام الٰہی کی حرمت بر قرار رہے اس لئے
بحالت موجودہ اسی مقصد عظیم کے پیش نظر تبرائی فتنہ کا استیصال آپ کا اولیں
فریضہ ہے اگر آپ کے ہاتھوں میں تلوار ہوتی تو بلاشبہ آپ پر جہاد بالسیف بھی
خاص نظم وضبط کے ساتھ فرض ہوتا لیکن اس تہی دستی کے باوجود اپنے ایمان
وضمیر کی رہنمائی میں اجتماعی قوت سے اس فتنہ عظیمہ کو ختم کر سکتے ہیں اور اللہ
تعالیٰ کے فضل سے امید ہے کہ آپ اس جہاد میں بھی کامیاب ہوں گے جس
طرح مدح صحابہؓ کے امتناعی قانون کو منسوخ کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

جریدہ نقیب پھلواری شریف

جلد ۷

غزوۂ احد میں بصیرتیں

سمع وطاعت کی تعلیم

حضرت رسول اللہ ﷺ روحی فداہ مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لاتے ہیں تو یہاں بھی آپ کو چین کے ساتھ اللہ کا نام بلند کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے، مجبوراً کفار اور دشمنان دین سے تلوار کے ذریعہ بہت مرتبہ جہاد کرنا پڑتا ہے۔ انہیں جہادوں میں ایک جہاد غزوۂ احد ہے، جو ماہ شوال ۳ھ میں ہوا تھا، کفار مکہ تقریباً تین ہزار جرار فوج لے کر مدینہ کی طرف حملہ کی نیت سے آرہے تھے اور ارادہ تھا کہ بس وہاں پر مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ اس خبر کو سن کر اصحاب سے مشورہ فرماتے ہیں کہ کیا کرنا چاہئے ہم لوگ مدینہ ہی میں رہیں، شہر کی گلیوں اور راستوں کی مورچہ بندی کرلیں تاکہ جب وہ بستی میں گھسنا چاہیں تو ادھر تمام مورچوں سے ہم لوگ ان کا مقابلہ کریں اور مکانوں کے چھپردل وچھت سے عورتیں تیر اندازی کریں، یا یہ کہ مجاہدین شہر چھوڑ کر میدان میں جائیں اور میدان میں جہاد کیا جائے، آنحضرت ﷺ کو پہلی بات زیادہ پسند تھی، اور بھی چند بزرگوں نے اسی پہلی

بات کو پسند فرمایا لیکن جو لوگ کسی وجہ سے غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے، انہوں نے رائے دی کہ میدان میں چل کر جہاد کیا جائے اور یہ ان کے محض کھلے میدان میں شوق جہاد کا تقاضا تھا اور انہیں کے اصرار کے سبب سے دوسرے لوگوں نے بھی اس دوسری رائے کی موافقت کی، آخر آنحضرت ﷺ فوراً مکان تشریف لے گئے، ادھر اصحاب کرام کی رائے میں تبدیلی ہوئی کہ ہم لوگوں نے خواہ مخواہ میدان میں نکلنے پر اصرار کیا، وہی پہلی بات مناسب ہے جو آنحضرت ﷺ کا بھی منشا تھا۔ الغرض جب آنحضرت ﷺ زرہ پہن کر اور مسلح ہو کر باہر تشریف لائے تو صحابہؓ نے اپنی تبدیلی رائے کا اظہار کیا اور عرض کیا باہر میدان میں جانا مناسب نہیں ہے تو آپ نے فرمایا کہ "ما ینبغی لنبی إذا لبس لأمته أن یضعها حتی یحکم الله بینه و بین عدوه" یعنی کسی نبی کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ جب وہ مسلح ہو جائے تو وہ پھر ہتھیار رکھدے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نبی اور اس کے دشمن کے درمیان فیصلہ کردے۔

مطلب یہ ہے کہ بعد مشورہ جب رائے قائم کر کے فیصلہ ہو جائے اور اس پر عمل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا جائے تو پھر اس پر عمل کرنا چاہئے۔

.اگر عزم کے بعد اس کے خلاف کیا جائے گا، تو ہمیشہ قوت فیصلہ کمزور رہے گی اور پھر قوت فیصلہ پر سے اعتماد جاتا رہے گا، اسی ایک پاک جملہ میں قوم اور رہنما دونوں کے لئے نہایت اہم درس ہے جس کی تفصیل کا موقع نہیں۔

بہر حال آپ مدینہ منورہ میں حضرت ابن مکتوم کو امام الصلوٰہ مقرر کر کے مدینہ سے خروج فرماتے ہیں اور مہاجرین و انصار کل ایک ہزار مجاہدین آپ کے ساتھ ہوتے ہیں اور جب مقام شوط پر پہونچتے ہیں جو مدینہ منورہ اور جبل احد کے درمیان واقع ہے، تو اس ہزار میں سے سواء تین سو سے زائد آدمی واپس ہو جاتے ہیں اور واپسی کا عذر یہ ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے ہماری رائے پر عمل کیوں نہیں کیا یعنی مدینہ ہی میں قیام فرماتے، باہر نہیں نکلتے، بلکہ ہمارے سوا دوسروں کی رائے پر عمل کیا۔ کہاں جاتا ہے کہ یہ شوشہ عبد اللہ ابن ابی نے چھوڑا تھا اور اس کے بہکانے سے دوسرے لوگ بھی بہک گئے اور جہاد سے واپس ہو گئے، کس طرح پر رنج ہو کر کس سے رنج ہو کر، رسول اللہ ﷺ سے، اور کس بنا پر کہ ان کی رائے پر عمل نہیں کیا گیا۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے والد ماجد عبد اللہ بن عمرو نے ان لوگوں کو بہت کچھ سمجھایا، مگر وہ لوگ نہ مانے آخر واپس ہو گئے، إنا لله وإنا إليه راجعون۔

مگر خدا کا کام نا تمام نہیں رہا، وہ خود گناہ گار ہوئے اور تاریخ کے اوراق پر اپنا سیاہ کارنامہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئے۔

کیا آج ہندوستان میں اس سیاہ کارنامہ کی تقلید نہیں ہو رہی ہے، کتنے مسلمان ہیں جو اکثر خدام مذہب، کارکنان ملت سے اس لئے خفا ہو کر علیحدہ ہو گئے ہیں کہ ان کی بات مانی نہیں گئی، چوں کہ وہ اصول شریعت اور مصالح ملت کے

خلاف ہیں اور صرف وہ خفا ہو کر علیحدہ ہی نہیں ہوتے بلکہ دوسروں کو بھی بہکاتے و گمراہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے حال پر رحم کرے اور سیدھے سادے مسلمانوں کو ان کے مکروہ کید سے بچائے۔

خیر ان کی واپسی کے بعد اب تقریباً ساڑھے چھ سو مجاہدین رہ گئے۔ انصار کے کچھ لوگوں نے بارگاہ نبوت میں عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو ہم اپنے پہلے حلیفوں میں سے کچھ سپاہی لے آویں مگر دین کے فدائی فوج کے واحد سپہ سالار نے قطعی انکار کر دیا کہ اللہ کی عبادت جہاد فی سبیل اللہ کے صف میں غیر مسلم کو شریک کرنے کی حاجت نہیں۔ پھر جب جہاد کے لئے عزم راسخ ہو چکا تو قلت و کثرت کے سوال کی گنجائش نہیں، مزید سپاہیوں کی جستجو تو عزم و ارادہ کو کمزور کرتا ہے اس لئے کہ جب اللہ کے راستہ میں مٹنے کا محکم فیصلہ کر لیا گیا اور قدم آگے بڑھ چکے تو پھر پیچھے کی طرف دیکھنا کیا معنی، یہ تو ارادہ کی کمزوری اور عزم کے فقدان کی دلیل ہے کیوں کہ عزم راسخ کرنے والوں کو کوئی طاقت پیچھے ہٹا نہیں سکتی، اگرچہ تعداد میں وہ کسی قدر کم ہوں تو پھر ان کو ادھر ادھر دیکھنے کی کیا حاجت ہے۔

بہر حال یہ ساڑھے چھ سو کی اسلامی فوج تین ہزار کفار کے مقابلہ کے لئے میدان میں اتری، آنحضرتؐ نے ان کی صف بندی کی، میمنہ میسرہ پر امراء مقرر ہوئے، پچاس تیر اندازوں کے امیر حضرت عبد اللہ ابن جبیر مقرر ہوئے

اور ان سب کو حکم دیا گیا کہ تم یہاں سے کسی حال میں نہ ہٹو، حتی کہ اگر تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ تمام اسلامی فوج شہید ہو گئی اور ان کو نوچ رہے ہیں جب بھی اس گھاٹی کو نہ چھوڑو۔ اس تمام نظم وترتیب کے بعد جب لڑائی شروع ہوئی ہے تو اس چھوٹی سی فوج کی اس دلیری اور بہادری سے مقابلہ کیا کہ تین ہزار سورماؤں کے پیر اکھڑ گئے اور مال غنیمت چھوڑ کر بھاگے اور وہ پچاس تیر انداز جو گھاٹی پر متعین تھے ان کو یقین ہو گیا کہ وہ اس طرح پسپا ہوئے کہ اب واپس نہیں لوٹ سکتے، اس سبب سے وہ بھی مال غنیمت کے جمع کرنے کی طرف دوڑ پڑے، ان کے امیر عبد اللہ ابن جبیر منع کرتے ہیں کہ تم لوگ یہاں سے نہ ہٹو، تم لوگوں کو تمہارے سپہ سالار سرکار دوجہاں روحی فداہ نے یہی حکم دیا ہے، مگر وہ نہ مانے اور گھاٹی خالی چھوڑ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزیمت خوردہ کفار نے اس گھاٹی کی طرف واپس آکر مسلمانوں کو ہر چہار طرف سے گھیر لیا اور تھوڑی دیر کے لئے مسلمانوں کی فتح شکست سے بدل گئی، یہاں تک کہ خود آنحضرت ﷺ بھی مجروح ہوئے، دندان مبارک شہید ہوا، إنا للله وإنا إليه راجعون۔

یہ فتح شکست سے کیوں بدل گئی، اور ستر مسلمان کیوں شہید ہوئے حتی کہ آنحضرت ﷺ کو بہت سخت اذیت پہونچی۔

صرف ایک حکم کی نافرمانی کی وجہ سے، کہا گیا تھا کہ گھاٹی کسی حال میں نہ چھوڑنا مگر چھوڑ دی گئی، ان کا ہر حکم دینا کہ یہاں سے نہ ہٹو، کیوں کہ حکم امام اعظم

اور سپہ سالار یہی ہے مگر ماتحت فوج نہیں مانتی، صرف امیر عبد اللہ ابن جبیر کیا کر سکتے تھے، ان کے ہاتھ میں تیر و کمان تو تھی مگر کیا وہ اس سے پورے درہ کی حفاظت کر سکتے یا ان کے ذریعہ سے اپنے ماتحتوں کو مجبور کر سکے کہ وہ درہ نہ چھوڑیں۔

الغرض جب سپاہی اطاعت نہ کریں تو بے چارہ جنرل کیا کر سکتا ہے اور اسی ایک نافرمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوشی غم سے، فتح شکست سے بدل گئی۔

اس پر غور کریں کہ کتنی نافرمانیاں کے قانون کے ماتحت حکم دیا جاتا ہے مگر خود رائی کر کے نافرمانی کی جاتی ہے اور سب سے بڑے حاکم ساتھ دوسروں کو بھی نافرمانی ان واقعات سے عبرت ناکامی اور نامرادی پر ماتم نہ کرو آنسو بہاؤ، اور توبہ کرو اور سمع و طاعت کی عادت ڈالو۔

تحدیث نعمت

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارنیہ را

آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی جس کی وجہ سے ان کی قومی و مذہبی زندگی محفوظ تھی۔ تمام صوبہ جات ہند میں ولاۃ اسلام متعین تھے، ڈویژنوں اور پرگنوں تک میں قاضی و مفتی مقرر ہوتے تھے، خزانۂ حکومت مسلمانوں کا اسلامی بیت المال تھا، مساجد و مقابر کی نگرانی ہوتی تھی، غیر مسلموں کے مظالم کا کوئی اندیشہ نہ تھا، نہ قربانی گاؤ پر کسی ہنگامہ و شورش کا کھٹکا تھا، نہ پیپل کی شاخ کاٹنے پر کسی شاخسانہ کا خوف دامن گیر، ہر جگہ نہایت اطمینان کے ساتھ سب مسلمان اللہ تعالیٰ کا نام بلند کرتے تھے، تمام غیر مسلموں کے نزدیک ایک غریب و مفلس مسلمان بھی مستحق صد تعظیم و تکریم تھا۔ یہ تمام باتیں اور اسی قسم کے تمام جماعتی نظام کی برکتیں و خوبیاں تقریباً کم و بیش سب ہی موجود تھیں، اور یہ محض اس لئے کہ مسلمانوں کا ایک اسلامی مرکزی نظام موجود تھا جس کے ساتھ تمام مسلمان وابستہ تھے، اجتماعی نظام کی برکات سے مالا مال تھے، انتشار اور پراگندگی کی نحوست اور لعنت سے محفوظ تھے، لیکن آخر مسلمانوں

کی بداعمالی وغفلت شعاری کی وجہ سے یہ نعمت عظمیٰ ان کے ہاتھوں سے چھن گئی، إن الله لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بأنفسهم (یعنی بیشک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالتوں کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالتوں کو نہیں بدلتے)۔

یہ اٹل قانون کارفرما ہوا، اسلامی حکومت زائل ہوئی اور ہندوستان پر انگریزی حکومت بمنزلہ عذاب الٰہی مسلط ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کل جو تخت نشیں تھے آج خاک نشیں ہیں، کل جو آزاد حکمراں تھے آج وہ غلام اور بدترین غلام ہیں، کل تک جو ہزاروں غرباء وفقراء کے دامنوں کو سیم وزر سے بھر دیا کرتے تھے آج وہ خود فقیر بے نوا ہیں، کل جن کی عبادت گاہیں آباد وپُر رونق تھیں آج وہ سنسان اور ویران ہیں، کل جن کی مسجدوں میں نہایت لائق اور دیندار امام ومؤذن مقرر تھے آج اکثر جگہوں میں روٹی کے چند ٹکڑوں کے لئے محض بیعلم اور نالائق لوگ امامت ومؤذنی کے لئے لڑ رہے ہیں، کل تک جو قومیں مسلمانوں سے آنکھ بھی برابر نہیں کر سکتی تھیں، آج وہ ان کے گھروں کو لوٹتی ہیں، قربانی گاؤ کو بند کرتی ہیں، قبرستان پر قبضہ کر کے ہل چلانے کی فکر کر رہی ہیں، کل جن کی عدالتوں میں غیر اقوام اپنے قضیوں اور جھگڑوں کی دادرسی کے لئے حاضر ہوتے تھے، آج وہ خود غیروں کی نمائشی ورسمی عدالتوں میں نہایت بے غیرتی کے ساتھ طوعاً وکرہاً حاضر ہوتے ہیں، کل تک جو غیر اسلامی قوانین کی تنفیذ یا تعمیل کو ظلم وفسق یا کفر سمجھتے تھے، آج وہ بلا کسی جھجک کے ان پر عمل

کررہے ہیں، اور کل تک جو لوگ غیر مسلم کے فیصلوں کو مسلمانوں کیلئے شرعاً غیر نافذ و باطل سمجھتے تھے آج وہ خود بلا تکلف ان کو جائز سمجھتے ہیں تا آنکہ تفریق بین الزوجین اور فسخ نکاح کے باب میں بھی غیر مسلم حکام کی چوکھٹوں پر جبہہ سائی کو جائز بلکہ شیاد فخر سمجھنے لگے۔

الغرض مسلمانوں کی حکومت کیا زائل ہوئی کہ ان کا قومی شیرازہ بالکل بکھر گیا، اور ایسی پراگندگی پھیلی کہ اجتماعیت و مرکزیت کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، پھر اس انتشار اور پراگندگی کے جو نتائج تھے وہ ظاہر ہوئے، اسی لئے ایام جاہلیت کے ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ولن یفلح قوم فوضی لا سراۃ لھم

ولا سراۃ لھم إذا جھالھم سادوا

یعنی جو قوم پراگندہ اور منتشر رہتی ہے جن کا کوئی سردار نہ ہو وہ ہرگز فوز و فلاح نہیں پاسکتی ہے اور نہ وہ قوم سردار والی کہی جاسکتی ہے جس کی سیادت محض جاہلوں کے ہاتھ میں ہو۔ پس اس انتشار اور پراگندگی کی وجہ سے جو کچھ بھی برائیاں پیدا ہوں اور جس قدر تباہی و بربادی ہو، یا ذلت و رسوائی ہو، قومی و مذہبی کاموں میں رخنے پڑجائیں، تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اسی لئے دین اسلام نے (جس کی تعلیمات دنیا و آخرت کی بھلائی کی کفیل ہیں) اجتماع قومی و مذہبی نظام کے قیام و بقا کے لئے بہت زیادہ تاکید کی ہے، منتشرانہ و پراگندگی کی زندگی گذارنے کو اس نے غیر اسلامی زندگی قرار دیا ہے، اور حکم دیا ہے کہ مسلمان جہاں

اور جس جگہ بھی رہیں جماعتی واجتماعی زندگی بسر کریں تا آنکہ اگر سفر میں بھی مسلمان ساتھ ہوں تو ایک شخص کو اپنا امیر بنالیں اور اس کی امارت کے ماتحت سفر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے ان اسلامی ملکوں کے لئے جہاں کفار مسلط ہو جائیں بلحاظ نصوص واحکام جماعت واجتماع یہ حکم دیا ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خود اپنے لئے مسلمان والی منتخب کر کے ولایت شرعیہ قائم کریں، بلکہ علمائے ہند میں حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی قدس سرہ العزیز پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ہندوستان میں انگریزوں کے قدم آتے ہی یہ فتویٰ دے دیا تھا کہ مسلمان اپنا والی منتخب کر کے اس کی ولایت کے ماتحت اپنے جماعتی واجتماعی کاموں کو انجام دیں حالانکہ ان کے زمانہ تک انگریزوں کا پورا تسلط بھی ہندوستان میں نہیں ہوا تھا، لیکن قرائن بتا رہے تھے کہ یہ قوم مسلط ہو کر رہے گی۔

اس لئے ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کے بعد ہی چاہئے تو یہ تھا کہ مسلمان خود اپنا کوئی امیر منتخب کر کے جماعتی واجتماعی نظام قائم کر لیتے، تاکہ پراگندگی اور انتشار کی لعنت سے محفوظ رہتے اور ان خرابیوں سے بھی بچتے جو لوازم انتشار ہیں، چنانچہ بعض اکابر علماء ہند نے اس اہم فریضہ کی طرف توجہ بھی کی اور اس کے بابت فتاویٰ بھی لکھے، مگر حکومت اسلامیہ کے زوال اور انگریزوں کی استیلاء وتسلط کے بعد فطرتاً وطبعاً جو وہن اور کمزوری ان میں پیدا ہو گئی تھی اس نے تمام بڑے بڑے ذی ہوش مسلمانوں کو بھی گوشہ نشین بنا دیا اور اس کے

بعد پھر ۱۸۵۷ء کے مظالم نے تو بڑے بڑے جری و بہادر مسلمانوں کو بھی پست ہمت بنادیا، اس وقت مسلمانوں کی جو حرکت جماعتی نظام کے قیام کے لئے ہوتی انگریز اس کو نہائیت مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے، اور قبل اس کے کہ کوئی جماعتی تحریک بار آور ہو اس کے محرکین کے لئے سولی کا تختہ ہوتا یا جیل خانوں کی کالی کوٹھری یا جزیرۂ انڈمان کی جلاوطنی۔

اور جب انگریز ۵۷ء کا غصہ اچھی طرح نکال چکے اور کسی قدر ان کے دل ٹھنڈے ہوئے تو تاج برطانیہ اور اس کے بااختیار نمائندوں کی طرف سے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی اشک شوئی کے لئے نہایت شاندار الفاظ کے ساتھ اعلانات ہونے لگے جس سے ان کو مطمئن کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے سے غافل کرنا مقصود تھا، اور یہ کہ ہندوستانیوں کو غافل رکھ کر شیر برطانیہ کے پنجہ گرفت کو مضبوط کیا جائے، چنانچہ یہ مقصد اس کا بخوبی پورا ہوا اور حکومت برطانیہ پوری قوت کے ساتھ ہندوستان پر مسلط ہوگئی، پھر کیا تھا جو بعض اسلامی ادارے مسلمانوں کے لئے خصوصیت سے باقی رکھے گئے تھے وہ سب بھی ایک ایک کر کے اٹھادیئے گئے، نہ محکمہ قضا رہا، نہ محکمہ صدر الصدور، نہ اوقاف کا نظام باقی رکھا گیا، نہ ججوں کے ساتھ مفتی اسلام کا عہدہ، الغرض یہ چند اسلامی چیزیں جو حسب معاہدہ یا حسب وعدہ انگریزوں نے باقی رکھی تھیں سب کی سب ایک جنبش قلم سے زائل ہوگئیں، اسی کے ساتھ جاگیروں اور زمینداریوں

کی ضبطی کے بعد جو کچھ دولت بچی کھچی تھی وہ بھی ختم ہو گئی، اب نوبت یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ ہندی غیر مسلم اقوام اپنی جبلی عادت کے مطابق انگریزوں کی خوشامد کر کے برسر اقتدار ہو گئے تھے، اور وہ جو کل نظر بھی برابر نہیں کر سکتے تھے مسلمانوں کے منہ آنے لگے، سر چڑھنے لگے۔ گویا جب سر سے پانی گذر گیا تو مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں وار سوچنے لگے کہ اب کیا تدبیر کی جائے، ان مفاسد کا کیونکہ سد باب ہو۔

چنانچہ اس وقت سے برابر زعمائے ملت اپنی عقل و دانش سے مختلف قسم کی تدبیریں کرتے رہے اور مسلمانوں کو ابھار کر حرکت عمل پیدا کرنے کے لئے بہت سے طریقے اختیار کیے۔

اسی اثناء میں علماء ربانیین جو حقیقۃً اپنی علمی ذمہ داریوں اور اجتماعی احکام کی واقفیت کی بنا پر انتشار دور کرنے اور ولایت شرعیہ قائم کرنے کے زیادہ ذمہ دار تھے وہ بھی غافل نہیں رہے، مگر عامہ مسلمین میں احساس کا نہ ہونا، پھر حکومت کے جور واستبداد کا خوف، یہ ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے اس کی طرف دفعۃً قدم بڑھانا کوئی آسان کام نہ تھا، اس لئے اصل مقصد کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے رفع جمود و پیدائش احساس کے لئے بطور تمہید بعض نہایت اہم کام ان حضرات نے بھی شروع کیا، مگر حالات کی نامساعدت، رفقائے کار کی عدم مطاوعت نے اس کا موقع نہیں دیا کہ قیام ولایت شرعیہ کا اعلان کیا جا سکے۔

آخر صوبہ بہار میں ہنود کی تاریخی ہنگامہ آرائیوں نے جو آرہ رائٹ (فساد آرہ) سے مشہور ہے، اور جو قدرت الٰہیہ کی طرف سے ایک سخت تازیانہ تھا ، علماء ہند بالخصوص علماء بہار کی آنکھیں کھول دیں، جس کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر قیام نظام شرعی و قومی کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ بحمد اللہ چند سالوں کی پیہم کوشش وتبادلۂ خیالات کے بعد ۱۹/ ماہ شوال ۱۳۳۹ھ کو وہ مبارک ساعت آئی جس میں علماء کرام و مشائخ عظام اور داعیان بہار کے علاوہ بعض بیرونی علماء کرام کی باہمی مشاورت سے بمقام پٹنہ جمعیت علماء بہار کے اجلاس خصوصی میں امیر شریعت کا متفقہ طور پر انتخاب ہوا، نیابۃً بیعت عامہ لی گئی، محکمہ شرعیہ کے قیام کا اعلان ہوا، اس طرح پر یہ نعمت عظمیٰ سب سے پہلے تمام ہندوستان کی سرزمین میں صوبہ بہار کو ملی جو شاید قسّام ازل نے بلحاظ اولیت اسی کے لئے ودیعت رکھی تھی، اس نعمت کا جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

قیام امارت شرعیہ اور اس کی تحریک کی یہ ایک نہایت مختصر تاریخ ہے جس سے صرف اس کی اہمیت و ضرورت پر متنبہ کرتے ہوئے یہ بتانا مقصود ہے کہ اہل علم حضرات اس فریضہ سے کلیۃً و قاطبۃً غافل نہیں رہے اگرچہ وہ موانع و مشکلات کی وجہ سے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے، اور جو چیز ڈیڑھ سو برس قبل ہونی چاہئے تھی اس کا ظہور اب ہوا، اور وہ بھی تمام ہندوستان کے ایک صوبہ میں۔ ”ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔ ولعل الله يحدث بعد ذلك أمراً۔

الغرض اواخر شوال ۱۳۳۹ھ میں امیر شریعت اول کا انتخاب ہوا، اس کے بعد محکمہ شرعیہ قائم ہوا اور عملی کام شروع ہوا۔ اور آج بحمد اللہ تقریباً آٹھ سال ڈیڑھ ماہ ابتدائے یوم انتخاب امیر شریعت کو ہوئے، ہم چاہتے ہیں کہ ایک مختصر اور اجمالی فہرست ثمرات و نتائج کی پیش کریں جو اس نظام اجتماعی اور محکمہ شرعی کی برکت سے ظاہر ہوئے جس سے معلوم ہوگا کہ اسلام اور مسلمانوں کو کس قدر فائدہ پہونچا۔

زلزلے اور حادثے

ایک تاریخی جائزہ

إن فی ذلك لعبرة لأولی الألباب.

بہار میں جو زلزلہ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ کو آیا جس کے متعلق مختلف آراء کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس حادثہ کبری سے عبرت پکڑنے کے بجائے مزید گمراہی پھیلائی جارہی ہے۔ اس لئے اس قسم کے حوادث کے متعلق نقیب کی اشاعت ہذا میں ایک اہم مقالہ شائع کیا جارہا ہے۔ اس سلسلہ میں ضرورت معلوم ہوئی کہ زلازل و حوادث کی ایک تاریخی فہرست بھی دے دی جائے تاکہ اہل فکر خود غور کر سکیں کہ اسلامی روایات واحادیث میں اس قسم کے حوادث کے جو اسباب بتائے گئے ہیں کیا ان کی صداقت میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟ مگر غور کرنے والوں کو چاہئے کہ ان تاریخی حوادث وزلازل کے مطالعہ کے ساتھ اوائل دوسری صدی ہجری سے لے کر اواخر نویں صدی ہجری تک عمرانی و تمدنی تاریخ پر بھی ایک گہری نگاہ ڈالیں کہ ارباب حکومت ظلم و عدوان کے علاوہ کن کن شدید گناہوں میں عموماً مرتکب تھے، امراء ورؤساء اور عام پبلک کا عموماً کیا حال تھا۔ جھوٹے نبی اور مہدی کس قدر پیدا

ہوئے اور وہ سب کچھ ہو رہا تھا جس سے بچنے کے لئے خبر دی گئی تھی۔ اس فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ ان زلازل و مہالک میں بہت سے ایسے شدید ہیں کہ ان کے مقابلہ میں بہار کے زلازل کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس فہرست میں جتنے زلازل و حوادث درج کئے گئے ہیں وہ وہی ہیں جن کو علامہ سیوطی نے ذہبی ابن کثیر اور ابن جوزی وغیرہ کے حوالوں سے تاریخ الخلفاء میں اپنی اپنی جگہ نقل کیا ہے۔ اور غالباً دو تین واقعات ایسے ہیں جو دیگر علماء کی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔

(۱) ۱۳۰ھ کو دمشق میں نہایت سخت زلزلہ آیا۔ بہت سے مکانات منہدم ہو گئے۔ بڑے بڑے پتھر گر پڑے۔ اور عجیب عجیب واقعات کا ظہور ہوا۔

(۲) ۱۳۱ھ کو پھر وہیں سخت زلزلہ آیا جس سے بہت کچھ نقصان ہوا اس زلزلہ میں قدرت کی کرشمہ سازی کا ایک خاص واقعہ قابل ذکر ہے کہ مسجد کی چھت پہلے پھٹ گئی اور اس قدر شگاف ہو گیا کہ نیچے سے آسمان صاف نظر آنے لگا۔ پھر ایک دوسرا جھٹکا زلزلہ کا ایسا آیا کہ اس مسجد کی چھت جو پھٹ گئی تھی پھر جٹ گئی اور اس کا شگاف بالکل بند ہو گیا۔

(۳) ۱۸۰ھ کو مصر میں نہایت سخت زلزلہ آیا جس سے سخت تباہی ہوئی۔ اسکندریہ کا نہایت مستحکم مینارہ بھی اس میں منہدم ہو گیا۔

(۴) ۲۰۳ھ کو خراسان اور بلخ میں نہایت سخت زلزلہ آیا جس سے مکانات منہدم ہو گئے۔ تقریباً ایک چوتھائی شہر نیست و نابود ہو گیا۔ بلخ کی جامع مسجد منہدم ہو گئی۔

(۵) ۲۳۳ھ کو ایسا سخت زلزلہ آیا کہ دمشق کے مکانات منہدم ہو گئے اور اس سے دب کر بے شمار مخلوق ہلاک ہو گئی، شہر انطاکیہ تباہ ہو گیا۔ جزیرہ میسو میا میں آگ لگ گئی جس سے تباہی آئی، اور موصل میں تو اس زلزلہ سے پچاس ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔

(۶) ۲۳۴ھ کو عراق میں ایسی باد سموم چلی جو ایران و شام تک پہونچی، جس سے کوفہ، بصرہ، بغداد، ہمدان، سنجار، موصل کی تمام زراعتیں جل کر خاکستر ہو گئیں۔ جانور اور بے شمار انسان ہلاک ہو گئے۔ پچاس روز تک یہ آفت مسلط رہی تمام لوگ کسب معاش سے معذور، بازار مسدود، مسافرین ہلاک ہوئے راستہ چلنا بند ہو گیا۔

(۷) ۲۳۷ھ کو عسقلان میں ایک ایسی آگ نمودار ہوئی جس نے تمام گھروں اور کھلیانوں کو جلا کر خاک بنادیا۔ یہ آگ تہائی رات تک مسلط رہی۔

(۸) ۲۴۰ھ کو مغرب، ارمینیہ اور عراق میں نہایت خوفناک اور تباہ کن سماوی وارضی آفتیں نازل ہوئیں۔ شہر خلاط (ارمینیہ) میں نہایت خوفناک آواز پیدا ہوئی جو غالباً زلزلہ کے ساتھ ہو گا، جس سے ہزاروں انسان مر گئے، مغرب کے سترہ گاؤں زمین میں دفن ہو گئے۔ اور عراق میں تو مرغی کے انڈے کے برابر اولے برسائے گئے۔

(۹) ۲۴۱ھ میں تاروں میں تموج پیدا ہوا اور اس کثرت سے تارے گرتے نظر آئے جس طرح ٹڈیاں گرتی ہیں، اور رات کے اکثر حصہ میں یہ ہولناک واقعہ ہوتا

رہا جس سے لوگ بہت خائف ہوئے، کیونکہ خلاف معمول واقعہ تھا۔

(۱۰) ۲۴۵ھ کو تو تمام دنیا میں سخت ترین زلزلہ آیا جس سے اکثر شہر غارت ہو گئے، بڑے بڑے قلعے اور پل تباہ ہو گئے۔ انطاکیہ کا ایک پہاڑ اس طرح گرا کہ وہ سمندر میں جا پڑا۔ اس زلزلہ میں سخت ترین آواز بھی سنائی دی، مصر اور بلبیس کے بہت سے لوگ اس آواز کی دہشت سے مر گئے۔ مکہ معظّمہ کے نہروں کا پانی خشک ہو گیا۔ اس مصیبت کے وقت خلیفہ متوکل نے عرفات سے مکہ تک پانی کی بہم رسانی میں ایک لاکھ دینار خرچ کئے۔

(۱۱) ۲۷۱ھ کو عراق میں پھر ایسا سخت زلزلہ آیا جس کی وجہ سے ہزاروں انسان دیواروں سے دب کر مر گئے۔

(۱۲) ۲۸۰ھ کو دبیل (علاقہ شام) میں عجیب عجیب مہلک آفات کا ظہور ہوا، سب سے پہلے فضا میں ظلمت و تاریکی چھا گئی جس سے لوگ پریشان ہو گئے۔ یہ حالت عصر تک باقی رہی۔ اس ظلمت کے بعد سیاہ ہوا چلنے لگی جو تہائی رات تک رہی۔ اس کے بعد سخت زلزلہ آیا جس سے تقریباً تمام شہر تباہ و برباد ہو گیا۔ شکستہ مکانوں کے ملبہ کے نیچے سے جتنی لاشیں برآمد ہوئیں ان کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار تھی۔

(۱۳) ۲۸۱ھ میں مقام رے اور طبرستان کے نہروں اور کنوؤں کا پانی دفعۃً غائب ہو گیا۔ لوگ بھوکے پیاسے مرنے لگے تا آنکہ لوگوں نے مردار کھایا۔

(۱۴) ۲۸۴ھ کو مصر میں ایک آفت یہ نازل ہوئی کہ گہری سرخی در و دیوار

پر نمودار ہوئی، تاآنکہ ہر انسان کو دوسرے کا چہرہ سرخ نظر آنے لگا۔ لوگ گھبرا کر توبہ و استغفار کرنے لگے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور یہ حالت دور ہو گئی۔ اس سرخی کی آفت عصر سے رات تک رہی۔

(۱۵) ۲۸۵ھ کو بصرہ میں زرد ہوا نمودار ہوئی۔ پھر اس کے بعد سبز رنگت کی ہوا ظاہر ہوئی پھر اس کے بعد سیاہ رنگ کی چلنے لگی، اور بہت سے دیگر شہروں تک یہ آفت پھیل گئی۔ اس کے بعد اتنے بڑے بڑے اولے برسے کہ ایک ایک کا وزن ڈیڑھ سو درہم کے برابر تھا۔ اس سنگ باری میں ایک عجیب و غریب یہ بات تھی کہ بعض گاؤں میں سیاہ و سفید دونوں قسم کے پتھر برسے، معلوم نہیں کتنے انسان ہلاک ہوئے، درختوں کے متعلق صراحت ہے کہ پانچ سو کھجور کے درخت اس طوفانی ہوا سے جڑ سے اکھڑ کر گر پڑے۔

(۱۶) ۲۸۹ھ کو بغداد میں نہایت سخت زلزلہ جو چند دنوں تک آتا رہا، خدا جانے مکانوں اور جانوں کا کس قدر نقصان ہوا ہوگا تفصیل درج نہیں ہے، اور اسی سال بصرہ میں ایسا سخت ہوا کا طوفان آیا کہ تمام نخلستان تباہ ہو گئے، جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی ہے۔

(۱۷) ۲۹۲ھ کو دجلہ میں ایسا سخت طغیان آیا کہ ۲۱ ہاتھ پانی معمول سے زیادہ ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام بغداد غرق آب ہو گیا اور عمارتیں گر پڑیں۔

(۱۸) ۳۰۰ھ میں وینوز (بلاد عراق) کا پہاڑ زمین میں دھنس گیا اور اس کے نیچے سے اس کثرت کے ساتھ پانی کا سیلاب آیا کہ بہت سے گاؤں و آبادیاں غرق آب

ہو گئیں۔

(۱۹) ۳۰۴ھ کو بغداد میں ایک نہایت خطرناک جانور نمودار ہوا جس کو لوگ زبزب کہتے تھے جو چھوٹے بچوں کو کھاجاتا تھا۔ عورتوں کے پستانوں کو کاٹ لیتا۔ مکانوں کے چھتوں پر شب کے وقت دکھائی دیتا تھا۔ تمام لوگ اس کی مصیبت اور خوف سے ہر وقت خائف رہتے۔ شب وروز حراست و نگرانی کرتے، اور اس کے بھگانے کے لئے طاشے بجاتے۔ چند راتوں تک یہ مصیبت مسلط رہی۔

(۲۰) ۳۱۴ھ میں موصل کے قریب دریائے دجلہ کاپانی بالکل منجمد ہو گیا تا آنکہ دجلہ کے جانوروں نے اس طرح عبور کیا جس طرح وہ خشکی پر چلتے پھرتے ہیں۔

(۲۱) ۳۲۳ھ جمادی الاول کو بغداد میں نہایت سخت ہوا چلی۔ تمام فضاو مکانات تاریک ہو گئے، اور یہ حالت عصر سے مغرب تک قائم رہی۔ پھر اسی سال ماہ ذیقعدہ شب کے وقت ساری رات اس کثرت سے تارے ٹوٹتے رہے جس کی نظیر کبھی دیکھی نہیں گئی تھی۔

(۲۲) ۳۲۹ھ کو بغداد میں اس زور کا سیلاب آیاکہ سارا بغداد غرق آب ہوا، ۱۹ہاتھ پانی بلند ہو گیا۔ تمام مکانات و عمارتیں منہدم ہو گئیں۔ بے شمار انسان اور جانور ہلاک ہوئے۔

(۲۳) ۳۳۴ھ کو بغداد میں اس شدت کا قحط پڑا کہ انسانوں نے مردار اور

گوبر تک کھایا (اللھم احفظنا) اور مردہ لاشوں کے ڈھیر راستہ میں پڑے رہے، کوئی اٹھانے والا نہ تھا۔ بہت سی مردہ لاشوں کو کتوں نے کھایا۔

(۲۴) ۳۴۴ھ کو مصر میں نہایت سخت اور خوفناک زلزلہ آیا جس سے تمام عمارتیں اور مکانات منہدم ہوگئے، اور تین گھنٹہ تک یہ زلزلہ باقی رہا۔ یہاں تک کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف دعا، استغفار کے لئے متوجہ ہوئے تو یہ بلا دور ہوئی۔

(۲۵) ۳۴۶ھ کو ایشیائے کوچک میں نہایت خوفناک زلازل و مہالک نازل ہوئے۔ رے، کالقان، حلوان میں نہایت ہلاکت خیز زلزلہ ہوا۔ علاقہ رے کے ڈیڑھ سو گاؤں مسلم زمین میں دھنس گئے۔ طالقان جہاں لاکھوں کی آبادی تھی، وہ بھی دھنس گیا، صرف ۳۰ آدمی زندہ بچے۔ اور حلوان کی بھی اکثر آبادی دھنس گئی۔ زمینیں ایسی پھٹیں کہ مردوں کی ہڈیاں باہر پھکا گئیں، گویا "اخرجت الارض اثقالھا" کی تصدیق لوگوں کے آنکھوں کے سامنے تھی، اور جابجا کثرت سے پانی کے چشمے ابل پڑے۔ نواح رے میں ایک خاص واقعہ اس زلزلہ کبریٰ کا یہ ہوا کہ ایک پہاڑ گر پڑا۔ اور ایک گاؤں مکانات و تمام آدمیوں اور سامانوں کے ساتھ زمین سے اڑ کر آسمان و زمین کے مابین معلق ہوگیا۔ پھر وہ نیچے گرا اور دھنسا دیا گیا۔ اور زمین میں بے شمار بڑے بڑے شگاف و دراز ہوگئے جس سے بدبودار پانی اور سخت دھواں نکلتا رہا (نعوذ باللہ من سخطہ) اور اسی سال دریا کا پانی ۸۰ ہاتھ کے قریب گھٹ گیا تا آنکہ دریا میں پہاڑ و جزائر نمودار ہوگئے تھے اور ایسی چیزیں ظاہر ہوئیں جو کبھی نہ دیکھی گئیں نہ سنی۔

(۲۶) ۳۴۷ھ کو ایشیائے کوچک میں پھر سخت زلزلے آئے، خاص کر قم،

حلوان، بلاد جبال جو آج کل بلاد عراق کے نام سے مشہور ہے، جس میں بلاد اصبہان، زنجان، قزوین، ہمدان، دینوز، قرمیس، رے وغیرہ شامل ہیں۔ نہایت سخت زلزلے ہوئے جن سے بے شمار مخلوق تباہ و برباد ہو گئی۔ اسی سال ایک دوسری آفت ٹڈیوں کی نازل ہوئی جس نے تمام غلوں اور زراعت کو چاٹ لیا۔

(۲۷) ۳۵۹ھ کو عراق میں ایک بہت بڑا تارہ ٹوٹا جس نے رات کو دن بنادیا، اس کی روشنی سورج کے مانند تھی، اور اس کے ٹوٹنے کے بعد نہایت سخت آواز سنائی دی جس طرح رعد کی آواز ہوتی ہے۔

(۲۸) ۳۷۸ھ کو عراق اور مسئومیا میں نہایت ہولناک آفتیں نازل ہوئیں، نہایت شدید ہوا کا طوفان فم الصلح میں آیا جس نے دجلہ کے پانی کو اڑادیا، تا آنکہ دریائے دجلہ کی زمین کھل گئی اور بہت سی کشتیاں غرق آب ہو گئیں، اور ایک چھوٹی کشتی جس پر جانور لدے ہوئے تھے اڑ گئی اور ارض خوخی میں جاکر گری جو چند دنوں کے بعد وہاں پائی گئی۔ بصرہ اور بغداد کو باد سموم نے تباہ کر دیا اور قحط کی وجہ سے بغداد میں موت عام واقع ہوئی۔

(۲۹) ۴۰۰ھ کو دریائے دجلہ کا پانی خشک ہو گیا، جزائر نکل آئے، جس کو لوگوں نے کرایہ پر بند وبست کیا۔ جو بالکل غیر معمولی بات تھی۔

(۳۰) ۴۵۶ھ کو مصر میں نہایت قحط پڑا جو سات سال تک مسلط رہا۔ عزیز مصر کی حکومت کے زمانہ میں جو قحط پڑا تھا جس کا واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ اس کے بعد یہ دوسرا قحط تھا مگر پہلے سے بڑھا ہوا۔ اس میں انسان نے انسان کو کھایا۔ ایک

ایک چپاتی کی قیمت پچاس پچاس اشرفی تھی۔

(۳۱) ۴۵۸ھ کو چاند کے مانند ایک نیا تارہ نمودار ہوا جس کی روشنی بہت تیز تھی جس سے لوگ بہت خوفزدہ ہوئے، دس روز تک اس کی خوفناکی باقی رہی پھر آہستہ آہستہ اس کی روشنی کم ہوئی تا آنکہ غائب ہو گئی۔

(۳۲) ۴۶۰ھ کو شہر رملہ میں نہایت سخت اور خوفناک زلزلہ آیا جس سے تمام شہر تباہ ہو گیا، صرف رملہ میں ۲۵ ہزار انسان ہلاک ہوئے۔ کنوؤں کے منڈیروں سے پانی ابل ابل کر بہنے لگے۔ ایک طرف یہ طغیانی، دوسری طرف دریا کا پانی ساحل سے ایک دن کی مسافت تک پیچھے ہٹ گیا۔ خشک زمین نکل آئی، مچھلیاں خشکی پر تڑپنے لگیں۔ ایسی ہولناکی کے وقت میں بھی ان مچھلیوں کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ان کے سمیٹنے کیلئے کچھ لوگ دوڑ پڑے۔ جب مچھلیوں کے پاس پہنچے تو دریا کا پانی ان پر لوٹ آیا اور سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ نہ معلوم آجکل مغرب زدہ قرآنی حکایات متعلق غرق فرعون میں کیوں شک کرتے ہیں۔ قرآن پر اگر ایمان نہیں ہے تو تاریخ تو ان کے نزدیک قابل تسلیم ہے۔ کیا یہ تاریخی واقعہ قصہ فرعون سے مشابہ نہیں ہے؟

(۳۳) ۴۶۶ھ میں دریائے دجلہ میں غیر معمولی طغیانی آئی تا آنکہ ۳۰ ہاتھ پانی اوپر چڑھ آیا۔ تمام بغداد غرق آب ہو گیا، تمام اموال اور جانور اور بے شمار انسانی جانیں تباہ و ہلاک ہوئیں، کچھ لوگوں نے کشتیوں میں پناہ لی اور دو جمعہ تک نماز جمعہ جہاز پر پانی کے اندر پڑھی گئی۔ خلیفہ وقت درگاہ رب العزۃ میں گریہ وزاری

کرنے لگے۔ تاآنکہ اس طغیانی کی مصیبت زائل ہو گئی، مگر بغداد صرف اینٹوں کا ایک ڈھیر تھا۔ ایک لاکھ سے زائد مکانات برباد ہوئے۔

(۳۴) ۸۷ ۴ ھ کو بغداد میں نہایت سیاہ ہوا چلی۔ برق و رعد اور صواعق کے اشتداد نے لوگوں کے حواس گم کر دیئے۔ اسپر مزید آفت یہ نازل ہوئی کہ فضا آسمانی سے بالو اور مٹی کی بارش ہونے لگی۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ بس اب قیامت آہی گئی۔ یہ حالت تین گھنٹہ مسلسل عصر کے بعد تک باقی رہی۔ امام ابو بکر طرطوسی نے اس واقعہ کا خود مشاہدہ کیا جسکو انھوں نے اپنے "امالی" میں ذکر بھی کیا ہے۔

(۳۵) ۵۰۴ ھ کو مصر میں نہایت سیاہ ہوا چلی جس سے دنیا تاریک معلوم ہونے لگی۔ انسان کو خود اپنا ہاتھ نظر نہیں آتا تھا، لوگوں کا دم گھٹنے لگا۔ اسی کے ساتھ دوسری بلا یہ نازل ہوئی کہ آسمان کی سمت سے سروں پر ریت اور بالو برسنے لگے۔ اب لوگوں کو ہلاکت کا یقین ہو گیا۔ لیکن یہ کیفیت تھوڑی دیر رہی پھر اس میں کمی ہوئی، اور سیاہی زردی سے بدل گئی۔ آخر یہ مصیبت زائل ہوئی، عصر سے مغرب تک یہ واقعات ہوئے۔

(۳۶) ۵۱۱ ھ میں نہایت سخت سیلاب آیا جس سے شہر سنجار اور اسکی شہر پناہ غرق ہو گئے اور ہزاروں مخلوق ہلاک ہو گئی۔ اس سیلاب میں شہر پناہ کے پھاٹک کا کواڑ چند کوس بہہ گیا اور چند سالوں کے بعد مٹی کے نیچے سے برآمد ہوا۔ اس حادثہ میں ایک عجیب واقعہ اللہ کی شان ربوبیت سے یہ ظاہر ہوا کہ ایک چھوٹا بچہ جو تخت پر تھا۔ تخت سمیت سیلاب میں بہہ گیا اور آخر ایک زیتون کے درخت میں پھنس کر رکا، اور وہ لڑکا

صحیح وسالم رہااور بڑی عمر تک زندہ رہا۔

(۳۷) ۵۲۴ھ کو شہر موصل میں آگ کی بارش ہوئی جس سے شہر کے بہت سے محلوں کے سینکڑوں گھر جلکر خاکستر ہوگئے۔ اور اسی سال بغداد میں اڑنے والے بچھو نمودار ہوئے۔ جس کے دو ڈنک تھے جس نے بہت سے لڑکوں کو ہلاک کردیا اور تمام لوگ اس آفت سے خوفزدہ ہوگئے۔

(۳۸) ۵۲۹ھ کو بغداد و نواح بغداد میں آفات ارضی وسماوی کا ایک تانتا بندھ گیا، برق وباداور زلازل نے شہروں میں انقلاب عظیم برپا کردیا۔ تمام لوگ حواس باختہ ہوگئے۔ مساجد وجوامع میں نماز وخطبے بند ہوگئے۔ اس واقعہ کی ہولناک اور تباہ کاری کااندازہ اس امر سے کیاجاسکتاہے کہ سلطان سنجر نے اپنے بھائی ملک مسعود کے ایک خط میں انھیں واقعات کواسطرح لکھاہے:

فقد ظهر عندنا من الآفات السماوية والأرضية ما لا طاقة لنا بسماع مثلها فضلا عن المشاهدة من العواصف و البروق والزلازل و دام ذلك عشرين يوما و تشويش العساكرانقلاب البلدان ولقد خفت على نفسي من جانب الله و ظهور آياته .

یعنی ہمارے سامنے آسمانی اور ارضی بہت سی ایسی نشانیاں ظاہر ہوئیں کہ جس کے سننے کی ہمیں تاب نہیں ہے۔ چہ جائیکہ ان کے دیکھنے کی۔ یہ آفات وآیات کیاہیں، تیز ہوائیں، بجلیاں اور زلزلے جو بیس روز تک ہوتے رہے اور جس سے تمام فوج پریشان اور مشوش ہوگئی اور شہروں میں انقلاب عظیم برپا ہوگیا۔ اللہ تعالی کی طرف

سے سخط و غضب اور آیات اللہ کے ظہور سے میں اپنی ہلاکت سے ڈرتا ہوں۔

(۳۹) ۵۳۳ھ کو مقام ختر میں بیس کوس تک سخت زلزلہ آیا، جس سے بہت سے مخلوق ہلاک ہوگئے، اور شہر ختر زمین میں دھنسادیا گیا، اور اس کی جگہ سیاہ پانی کی ایک جھیل نمودار ہوگئی (نعوذ باللہ من سخطہ)۔

(۴۰) ۵۴۴ھ کو بغداد میں پھر شدید زلزلہ آیا اور تقریباً دس مرتبہ اس کا شدید جھٹکا ہوا۔ نہ معلوم کس قدر جان و مال کا نقصان ہوا ہوگا۔ اس زلزلہ کی شدت کا یہ عالم تھا کہ مقام حلوان کا ایک پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑا۔

(۴۱) ۵۴۵ھ کو فرعون کی طرح یمن میں قدرت الٰہی کی یہ نشانی ظاہر ہوئی کہ خون کی بارش ہوئی، تمام زمین خون سے رنگین ہوگئی اور اس خون کے داغ و نشان لوگوں کے کپڑے پر باقی رہے۔ گویا "فارسلنا علیهم الطوفان والجراد والقمل و الضفادع و الدم آیات مفصلات فاستکبروا وکانوا قوما مجرمین" (اعراف ر ۱۶)

نہ معلوم آج کل کے مغرب زدوں کو ان تاریخی واقعات کی خبر ہے یا نہیں ؟

(۴۲) ۵۶۶ھ کو بغداد میں نہایت شدید سرخی آسمان پر ظاہر ہوئی، اور سرخی اسقدر تیز تھی کہ اس کی روشنی دیواروں پر پڑتی تھی۔

(۴۳) ۵۶۹ھ کو بغداد اور نواح بغداد میں چند قسم کے آفات آئے۔ (۱) نارنجی کے برابر اولے برسے، جس کی وجہ سے مکانات چور و منہدم ہوئے۔ اور بہت

سے انسان مرے، مویشیاں ہلاک ہوئیں۔ (۲) پھر دجلہ میں ایسی طغیانی ہوئی کہ بغداد غرق ہو گیا۔ اس سال دجلہ کے ساتھ فرات میں بھی طغیانی ہوئی تھی جس کی وجہ سے گاؤں اور کھیتیاں تباہ ہو گئیں۔ آخر لوگ خوفزدہ ہو کر اللہ تعالی کی طرف رجوع ہوئے۔ (۳) قدرت الہی کا ایک عجیب کرشمہ یہ ظاہر ہوا کہ ایک طرف دجلہ و فرات کی طغیانی تھی اور دوسری طرف نہر و جھیل جو دجلہ میں آ کر گرتی ہے اس کے آس پاس کی زراعتیں خشکی کی وجہ سے تباہ ہو گئیں۔

(۴۴) ۵۷۶ھ کو بغداد میں نصف شب کے وقت نہایت سخت ہوا چلی اور آسمان کی سمت آتش کے ستون نمودار ہوئے تا آنکہ اس کی ہولناکی سے خائف ہو کر لوگ آہ و بکا اور چیخ و پکار میں مشغول ہوئے، آخر صبح صادق کے بعد یہ آفت دور ہوئی۔

(۴۵) ۵۹۲ھ کو مکہ معظمہ میں سیاہ ہوا ایسی چلی کہ تمام فضا پر محیط ہو گئی۔ اور لوگوں کے جسموں و سروں پر سرخ سرخ بالو گرے۔ بیت اللہ کے رکن یمانی کا ایک حصہ گر پڑا۔

(۴۶) ۵۹۳ھ کو ایک بہت بڑا تارا ٹوٹا، جس کے ٹوٹنے سے نہایت خوفناک آواز سنائی دی اور مکانات اور زمین ہل گئی۔ لوگ توبہ و استغفار اور آہ و بکا میں مشغول ہو گئے، اور لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔

(۴۷) ۵۹۷ھ کو مصر، شام، عسو بہا میں نہایت شدید زلزلہ آیا جس نے بہت سے مکانات و قلعوں کو منہدم کر دیا۔ بصری کے علاقہ میں ایک گاؤں بالکل زمین میں دھنس گیا۔

(۴۸) ۵۹۹ھ کو نہایت کثرت سے تارے گرنے لگے جس طرح ٹڈیاں گرتی ہیں۔ تمام لوگ خوفزدہ ہوئے اور اللہ اللہ کرتے ہوئے دعاواستغفار میں مشغول ہوئے۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس کثرت سے تاروں کا گرنا ایک رسول اللہ ﷺ کے ظہور کے وقت ہوا تھا اس کے بعد پھر اس سال ہوا۔

(۴۹) ۶۵۲ھ کو عدن میں نہایت تیز آگ ظاہر ہوئی جس کے شرارے سمندر میں جاکر گرتے تھے، اور یہ رات کو نظر آتے تھے، اور دن کے وقت اس آگ سے سخت دھواں نظر آتا تھا۔

(۵۰) ۶۵۴ھ، ۳ جمادی الاخری، شب چہار شنبہ کو مدینہ منورہ میں پہلے ایک سخت آواز سنائی دی پھر اس کے بعد سخت زلزلہ ہوا، اور ہر گھنٹہ یا گھنٹہ کے بعد ۵ تاریخ تک یہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد حرہ میں قریظہ کے قریب آتش سیال نمودار ہوئی جو مدینہ منورہ کے گھروں سے نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آگ دیکھنے والے کے قریب ہے، اور وہ آگ سیلاب کی طرح وادی شطا کی طرف گویا ایک آگ کا پہاڑ تھا جو بہہ رہا تھا اور اس سے بڑے بڑے شرارے اڑ رہے تھے تا آنکہ اس آگ کی روشنی مکہ معظمہ اور فلاۃ سے نظر آئی۔ اس ہولناک واقعہ کو دیکھ کر تمام اہل مدینہ رسول اللہ ﷺ کے قبر شریف کے گرد جمع ہو گئے اور توبہ واستغفار میں مشغول رہے۔ یہ کیفیت ایک ماہ سے زیادہ تک رہی۔ علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ اس آگ کی خبر متواتر طور پر ثابت ہے، اور یہ وہ ہی آگ تھی جس کے خروج کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی تھی کہ لاتقوم الساعة حتی تخرج نار من أرض الحجاز تضیئ بها اعناق الإبل

ببصری۔ یعنی قیامت سے پہلے ارض حجاز سے ایک ایسی آگ ظاہر ہوگی جس کی روشنی سے بصری میں اونٹوں کی گردنیں دیکھی جائیں گی۔ چنانچہ اس آگ کی روشنی بصری تک پہنچی، اور بصری والوں نے اس روشنی میں اونٹ کی گردنیں دیکھیں۔

(۵۱) ۶۷۹ھ کو دیار مصر میں ۹/ ذی الحجہ کو صواعق اور اولوں کی آفت نازل ہوئی۔ یہ اولے بہت بڑے بڑے تھے۔ نہ معلوم اس میں کتنی جانیں تلف ہوئیں۔

(۵۲) ۷۰۲ھ کو مصر و شام میں سخت زلزلہ آیا جن کی وجہ سے مکانات منہدم ہوئے اور کثیر مخلوق دب کر مر گئی۔

(۵۳) ۷۱۷ھ کو دریائے نیل میں بے مثل طوفان آیا جس سے بہت سے شہر برباد ہو گئے اور بے شمار انسان ہلاک ہوئے۔

(۵۴) ۷۲۴ھ کو دریائے نیل میں پھر سخت طغیانی ہوئی اور ساڑھے تین ماہ تک اس طوفان کی ہلاکت خیزی سے مصر تباہ ہوتا رہا۔

(۵۵) ۷۸۲ھ کو حلب میں ایک نہایت عبرت انگیز واقعہ ہوا کہ ایک شخص کا چہرہ سور کے مثل ہو گیا۔ اس کا واقعہ اس طرح ہے کہ امام نے جب نماز شروع کی تو ایک نالائق و بیہودہ شخص نے امام کے ساتھ حالت نماز میں مسخراپن اور کھیل شروع کیا۔ لیکن امام نے نماز کو منقطع نہیں کیا وہ سکون اور اطمینان سے نماز پڑھتا رہا۔ لیکن جب امام نے نماز سے فارغ ہو کر سلام پھیرا تو اس مسخراپن کرنے والے کا چہرا سور جیسا ہو گیا اور وہ فوراً اس مسخ شدہ صورت کو لے کر جنگل میں بھاگ گیا۔

(۵۶) ۸۱۲ھ کو دریائے نیل میں پھر شدید طغیانی آئی اور ۲۲ ہاتھ اوپر چڑھ آیا۔ اسی سے تباہی وہلاکت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۵۷) ۸۲۲ھ کو بلاد ازرکان (فارس) میں نہایت شدید زلزلہ آیا، جس سے ایک عالم تباہ ہو گیا۔

(۵۸) ۸۲۳ھ کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اظہار کے لئے ایک عجیب واقعہ یہ ہوا کہ لوگوں نے مقام غزہ میں ایک اونٹ ذبح کیا تو اس کے گوشت سے ایسی روشنی نکلی جس طرح شمع کی روشنی ہوتی ہے۔ آخر اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا کتے کو دیا گیا تو اس نے بھی نہیں کھایا۔

(۵۹) ۸۲۴ھ کو دریائے نیل میں پھر شدید طغیانی ہوئی جس سے تمام زراعت غرق آب ہو گئی۔

(۶۰) ۸۲۵ھ کو قاہرہ (مصر) میں ایک خفیف زلزلہ آیا اور نیل میں بھی طغیانی ہوئی۔

(۶۱) ۸۸۶ھ میں ۱۷ر محرم یوم یکشنبہ کو عصر کے بعد نہایت سخت زلزلہ آیا۔ تمام زمین پانی کی طرح موج مارنے لگی۔ تمام گھر اور پہاڑ کو نہایت شدید جنبش ہوئی لیکن ایک لمحہ میں سکون ہو گیا۔ اسی زلزلہ میں مدرسہ صالحیہ کے گرنے سے قاضی القضاۃ شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا۔

(۶۲) ۸۸۶ھ کو مدینہ منورہ (زادہا اللہ تعالیٰ شرفاً و تعظیماً) میں ۱۳ر

رمضان المبارک کو آسمان سے ایک بجلی مئذنہ (اذان کی جگہ) پر گری جس سے وہ جل گیا۔ مسجد شریف کی چھت بھی جل گئی۔ بجز دیوار کچھ باقی نہیں رہا۔ یہ نہایت ہولناک واقعہ تھا جو اسی شب میں ہوا۔

(۶۳) ۹۲۰ھ کو از ربائکان میں ایسا سخت ترین زلزلہ آیا جس کے صدمہ سے ایک عالم تباہ اور فنا ہو گیا۔

(۶۴) ۹۴۲ھ کو شہر بزولی اور بحر او قیانوس میں نہایت سخت زلزلہ آیا۔ اس زلزلے میں اس کا ساحل اپنی جگہ سے بہت دور ہٹ گیا اور سمندر کے وسط میں زمین پھٹ کر ایک نیا پہاڑ نکل آیا جس کی بلندی سو ہاتھ تھی اور اس کا محیط تین میل۔

(۶۵) ۹۹۴ھ کو نواح ناگپور میں پہاڑ سے ایسی آگ بر آمد ہوئی جس سے وہ پارہ پارہ ہو گیا۔ اس حادثہ میں دس ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔

(۶۶) ۱۰۰۳ھ کو قشلان میں ایسا سخت زلزلہ آیا کہ زمین پھٹ کر سیلاب بہا اور پورا شہر غرق آب ہو گیا۔

(۶۷) ۱۰۰۴ھ کو جزیرہ صقلیہ میں نہایت سخت زلزلہ آیا۔ زمین پھٹی جس سے چند نہریں گہری گہری نکل آئیں۔ اس حادثہ میں ۵۹۰۶۰ آدمی ہلاک ہوئے۔

(۶۸) ۱۰۰۹ھ کو شہر ارمینیہ مین نہایت سخت زلزلہ آیا، زمینیں پھٹیں، سیاہ سیاہ سنگریزے اڑے، نوے میل تک اس کا اثر پہونچا، لوگ ہلاک و تباہ ہوئے، اس زلزلہ میں بھی نہایت سخت ہولناک آواز تھی۔ زلزلہ دوپہر کے وقت ہوا تھا مگر تاریکی

ایسی شدید پھیلی کہ لوگ چراغ جلانے پر مجبور ہوئے۔

(۶۹) ۱۵۰۹ء بماہ اپریل ۱۴ر تاریخ قسطنطنیہ میں ایسا سخت زلزلہ آیا جس میں ایک ہزار ستر گھر بالکل مسمار ہو گئے اور ایک سو نو مسجدیں گریں اور شاہی محل کا بھی ایک حصہ گرا۔ یہ زلزلہ ۴۵ دن تک آہستہ محسوس ہوتا رہا۔

(۷۰) ۱۵۳۸ء کو شہر سیظ میں سخت زلزلہ آیا۔ زمین پھٹ کر اس قدر پانی کا سیلاب چلا کہ شہر غرق آب ہو گیا۔

(۷۱) ۱۰۳۷ء کو بحر اوقیانوس کے جزیرہ مینمائل میں تین مرتبہ زلزلہ نہایت سخت آیا۔ آخر وہ جزیرہ بحر اوقیانوس میں دفن ہو گیا۔

(۷۲) ۱۰۴۱ء کو کوہ نیویوس سے نہایت گرم پانی اس کثرت اور زور سے بہا کہ بہت سے گاؤں ڈوب گئے اور ہزاروں جانیں ضائع گئیں۔

(۷۳) ۱۰۶۰ء کو استنبول میں نہایت سخت زلزلہ آیا جو چالیس روز تک رہا، جس میں جان و مال کا بے شمار نقصان ہوا۔

(۷۴) ۱۰۷۷ء کو روم اور اس کے نواح میں چند مرتبے زلزلے نہایت شدید ہوئے۔ جس میں چند شہر بالکل غارت وویران ہو گئے اور چند پہاڑ پھٹ گئے، پھر وہیں طاعون آیا، برف باری ہوئی جس میں جانور اور چڑیاں تک ہلاک ہوئیں۔

(۷۵) ۱۱۱۱ء کو جاوا میں اس زور کا زلزلہ آیا کہ پندرہ پہاڑ غرق آب ہو گئے۔

(۷۶) ۱۱۳۴ء کو ساحل اوقیانوس پر زمین سے آگ نکلی جس سے بہت

سے شہر اور پہاڑ جل گئے۔

(۷۷) ۱۱۵۹ھ کو بندر کالبوعہ میں سخت زلزلہ آیا اور اس زلزلہ سے سمندر میں اس قدر تلاطم اور تموج پیدا ہوا کہ اس کی موجوں نے شہر کو دریابرد کر دیا۔

(۷۸) ۱۲۰۹ھ کو شہر لیویوس میں سخت زلزلہ آیا جس نے شدید نقصان پہونچایا۔

(۷۹) ۱۲۱۷ھ کو بدخشاں میں تین شب کو شام کے وقت نہایت سنہری سرخی پورب میں نمودار ہوتی رہی جو صبح کے قریب غائب ہوئی تھی۔

(۸۰) ۱۲۳۸ھ کو ضلع سماوانک اضلاع جاوا میں زلزلہ آیا، زمین پھٹی، آگ برآمد ہوئی۔

(۸۱) ۱۲۴۹ھ کو بہار اور ہندوستان کے دور دراز بلاد میں زلزلہ آیا جس میں مکانات بھی گرے۔ نیپال کے ایک پہاڑ پر ایک مندر تھا وہ پہاڑ مندر سمیت زمین میں دھنس گیا اور اس جگہ پانی کا تالاب بن گیا۔ اسی زلزلہ کی یادداشت پھلواری شریف کے بزرگوں کے نوشتوں میں مرقوم ہے۔ یہ زلزلہ ۱۴ ماہ تک تھوڑے وقفہ سے ہوتا رہا۔ فقط

رانچی کا صدارتی خطاب

حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار نے بحیثیت صدر اجلاس جمعیۃ علمائے ضلع رانچی منعقدہ ۷ رجولائی ۳۹ء زبانی خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ اب ایک کرم فرمانے اس تقریر کو بھیجا ہے، اگرچہ یہ پوری تقریر نہیں ہے بلکہ اس کا خلاصہ ہے، لیکن اس سے حضرت محترم کی تقریر کا کسی قدر مفہوم ادا ہو جاتا ہے، اس لئے ہم اس کو شائع کر رہے ہیں۔ (مدیر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبہ مسنونہ کے بعد حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار نے قبول صدارت کے سلسلہ میں فرمایا کہ میں رواجی طریقہ پر صدارت کا رسمی شکریہ ادا نہیں کرنا چاہتا، مگر میں اس محبت و خلوص کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس کی بنا پر آپ نے مجھ کو اپنی جمعیۃ کا صدر منتخب کیا ہے، اس کے بعد حضرت مولانا مد ظلہ نے سورۂ فاتحہ کی تلاوت فرمائی اور اس کی آخری آیتیں ”اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین أنعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین“ پر ڈیڑھ گھنٹہ تک مسلسل بصیرت افروز تقریر فرمائی۔

آپ نے فرمایا کہ میرے اولین مخاطب مسلمان ہیں۔ مسلمان آج پروگرام کے لئے پریشان ہیں، ان کو اپنے لئے لائحہ عمل نہیں ملتا ہے، میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ ان کو سورہ فاتحہ کی ان آخری آیتوں میں اپنا نصب العین بھی ملے گا اور پروگرام بھی، نیز یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ جمعیۃ علماء کا جو پروگرام ہے اسی قرآنی لائحہ عمل کی روشنی میں ہے۔

اس کے بعد آپ نے خصوصی طور پر نصب العین کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی طرف توجہ دلائی کہ پنجگانہ نماز جو ہر مسلمان پر فرض ہے اس میں کم از کم ۲۰ مرتبہ سورہ فاتحہ کو پڑھا جاتا ہے اور اس کا پڑھنا واجب یا فرض قرار دیا گیا ہے اور بغیر اس کے نماز کو ناقص ٹھہرایا گیا ہے، کبھی آپ نے اس پر غور کیا ہے کہ قرآن کے تین پاروں میں سے کسی سورہ کو یا کسی سورہ کی کسی آیت کو یہ اہمیت کیوں نہیں دی گئی؟ اور یہ خصوصیت محض سورۂ فاتحہ کو کیوں بخشش فرمائی گئی ہے اور اس کی کیا وجہ ہے؟

میرے عزیزو!

اس کا راز یہ ہے کہ قومی نصب العین، جماعتی نظریہ، ملی مطمح نظر چوں کہ انسانی زندگی کے دائرہ عمل کا مرکزی نقطہ ہوتا ہے اور عملی زندگی کے دائرہ کا ہر خطہ اسی نقطہ پر جا کر ختم ہوتا ہے، اس لئے اس کی حیثیت بنیاد و اساس کی ہوتی ہے اور اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے اور اسی نقطۂ نظر سے یہ ضروری ہوتا

ہے کہ وہ نصب العین ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے تاکہ عملی زندگی کا کوئی قدم اور انسانی جد وجہد کا کوئی اقدام ایسا نہ ہو جو تاریکی میں اٹھایا گیا ہو اور نصب العین کے خلاف ہو، یا اس سے الگ ہو بلکہ عملی زندگی کا ہر قدم اور انسانی جد وجہد کا ہر اقدام اسی نصب العین کی روشنی میں ہو اور اسی کے مطابق ہو اس اصول پر چونکہ مسلمانوں کے نصب العین کو اس سورہ میں بیان فرمایا گیا ہے، یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اس کو پانچوں وقت کی نمازوں میں مسلمان پڑھا کریں اور اس ذریعہ سے کم از کم رات دن میں ۳۲ مرتبہ اسی نصب العین کی یاد تازہ ہوتی رہے اور ان کی آنکھوں سے یہ نصب العین اوجھل نہ ہو۔

اس کے بعد نصب العین کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "اھدنا الصراط المستقیم" میں جس کے معنیٰ ہیں کہ اے اللہ ہم کو سیدھی راہ کی ہدایت فرما، لفظ "صراط" کے معنیٰ سڑک نہیں ہیں بلکہ عملی زندگی کی راہ ہے جس کی ایجابی شکل کا بیان "أنعمت علیھم" ہے یعنی جس کی عملی زندگی کی طلب اور التجا ہے، اس سے مطلوب و مقصود یہ ہے کہ اپنے برگزیدہ انعام یافتہ منعم علیہم جماعت کی راہ کی ہدایت اور نوازش ہو، یہ برگزیدہ انعام یافتہ جماعت کون ہے، قرآن میں اس کی تشریح موجود ہے کہ وہ انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کی جماعت ہے، ارشاد ہے:

فأولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء

والصالحين وحسن أولئك رفيقا (سورہ نساء ع ۵۸)۔

(وہ لوگ ان کی معیت میں ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے (اور وہ) انبیاء ہیں صدیقین ہیں، شہداء ہیں، صالحین ہیں اور رفاقت کے لئے یہی لوگ بہتر ہیں)۔

بہر حال مسلمانوں کی عملی زندگی کی راہ ان کا لائحۂ عمل، ان کا پروگرام، وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام کا لائحۂ عمل اور پروگرام تھا اور یہی لائحۂ عمل صدیقین اور شہداء اور صالحین کا تھا اور ان کی عملی زندگی اور سعی و جہاد کا جو کچھ مقصد تھا، اسی کا دوسرا نام نصب العین ہے اور یہ ایسی بدیہی اور روشن چیز ہے جو ان کی عملی زندگی کے ہر قدم اور ان کی سعی و جہاد کے ہر اقدام میں نمایاں اور محسوس ہے اور وہ حکومت الٰہیہ کا قیام ہے جس کی تعبیر قرآنی زبان میں قیام قسط یعنی قیام عدل اور اجراء امن و سلام ہے، سورۂ حدید میں اس کی طرف ان لفظوں میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ:

لقد أرسلنا بالبينات وأنزلنا معهم الكتاب والميزان ليقوم الناس بالقسط (سورہ حدید ع ۳ پارہ ۲۷)۔

(ہم نے اپنے رسولوں کو بینات دے کر بھیجا ہے اور ان کے ساتھ میزان اور کتاب اتارا ہے مقصد یہ ہے کہ عام انسانوں میں قسط (عدل) کا قیام ہو)۔

بہر حال مسلمانوں کا پروگرام مسلمانوں کا لائحۂ عمل ایسا ہے جس کو وہ

چوبیس گھنٹے میں بتیس مرتبہ دہراتا اور تکرار کرتا ہے اور اس کی یاد تازہ رکھتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے توجہ دلائی کہ اب ہم کو جمعیۃ علماء کی عملی زندگی پر غور کرنا چاہئے کہ وہ منعم علیہم کی زندگی کے مطابق ہے یا نہیں؟

انبیاء کرام کی عملی زندگی کا حاصل کیا تھا، جو قرآن کا مطالعہ کرتا ہے اس پر ظاہر ہے کہ اس کا حاصل خدا کے بندوں کو غلط راہ سے ہٹانا، جابر قوتوں کا توڑنا اور ظلم کا دور کرنا ہے، آپ قرآن کا بار بار مطالعہ کیجئے تو آپ کو مشاہد اور محسوس طور پر نظر آئے گا کہ یہی حضرت موسیٰؑ نے کیا اور یہی حضرت ابراہیمؑ نے کیا اور یہی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور دیگر انبیاء کرام نے انجام دیا اور یہی جمعیۃ علماء آج کر رہی ہے۔ افسوس مسلمان زعماء آج اپنا لائحۂ عمل اور پروگرام کھو کر پریشان ہیں اور آئے دن مغربی دستور پر اپنے لئے اسکیم پر اسکیم بناتے ہیں اور مسلمانوں کے دکھ کا مداوا سمجھ کر اس کے فریب میں خود مبتلا ہیں اور عام مسلمانوں کو بھی مبتلا کئے ہوئے ہیں، حالانکہ مسلمانوں کے دکھ کی دوا مغرب میں نہیں اور ٹالسٹائی کی زندگی میں نہیں، دستور یورپ اور آئین افرنجیت میں نہیں، بلکہ مشرق میں انبیاء، صدیقین شہداء اور صالحین کی زندگی اور وحی الٰہی کی کتاب محکم میں ہے جس پر نگاہ مفتی کفایت اللہ کی ہے، شیخ الحدیث حسین احمد کی ہے، ترجمان قرآن احمد سعید کی ہے، نہ کہ مسٹر جناح کی ہے، سر رضا علی کی ہے، راجہ محمود آباد کی ہے فللہ در من قال۔

تجھے یہ فریب کہ مستی و خودی مئے کے جام و سبو میں ہے
ہمیں یہ یقین کہ نگاہِ ساقی فتنہ گر کی نظر میں ہے

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ تو "اھدنا الصراط المستقیم" کا ایجابی پہلو تھا اس کا سلبی پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کا پروگرام ضالین اور مغضوب علیھم کے طرز عمل پر نہ ہو۔ ضالین اور مغضوب علیھم سے مراد بالاتفاق عیسائی اور یہودی ہیں اس تنبیہ سے مقصد یہ ہے کہ وحی الٰہی میں یہ دونوں جماعتیں بحیثیت جماعت مسلمانوں کے مستقبل کے لئے مضر و مہلک ہیں، لہذا مسلمانوں کو ان سے اور ان کی راہ سے الگ رہنا چاہئے۔ نیز خدا کے علم ازلی میں یہ معلوم تھا کہ مسلمانوں کو مٹانے کے لئے مسلمانوں کے دین کو برباد کرنے کے لئے یہی دو جماعتیں ہوں گی جو پورے فریب اور دجل کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے مسلمانوں کے لئے گمراہ کن پروگرام رکھیں گی اور ہلاکت و بربادی کے لائحہ عمل کو ان کے سامنے تمدنی اور معاشرتی فلاح و اصلاح کے نام سے پیش کریں گی۔ پھر سب سے زیادہ جو چیز اس سلبی پہلو پر تنبیہ کے لئے داعی تھی وہ ان کی فطرت ثانیہ کی وہ قساوت بھی تھی جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ ان کی جماعتی فطرت یہ ہے کہ ان میں حق کے قبول و انفعال کی استعداد نہیں ہے بلکہ ان کی فطرت اور جبلت کا یہ اقتضاء ہے کہ اسلام دشمنی میں جماعتی حیثیت یہ مزاج رکھتی ہیں کہ یہ مسلمانوں سے اس وقت تک خوشنود نہیں ہوں گے جب تک مسلمان مرتد ہو کر ان کی طرح یہودی اور عیسائی نہ ہو جائیں ان کا آخری نقطۂ نظر مسلمانوں کا اسلام کو خیر باد کہنا ہے اور ان کی فطری خواہش اور جبلی جذبہ ہے کہ

اسلام اور اسلامی تمدن، اسلامی معاشرت، اسلامی شعار پردۂ دنیا پر باقی نہ رہے، ارشاد ہے:

ولن ترضى عنك اليهود ولا النصارى حتى تتبع ملتهم (سورہ بقرہ ع ۱۴)۔

(تم سے ہرگز یہود اور نصاریٰ راضی نہ ہوں گے یہاں تک کہ قبول کر لو ان کے دین کو)۔

بخلاف مشرکین کے کہ ان کی جماعتی فطرت میں قبول وانفعال کی استعداد ہے اور اس کی طرف قرآن مجید نے ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے کہ:

ودو لو تدهن فيدهنون۔

(وہ چاہتے ہیں تم ملائم پڑو تو وہ بھی ملائم ہو جائیں)۔

اور ان کے اسی قبول حق کی استعداد کی یہ عملی شہادت ہے کہ وحی الٰہی نے ان کے متعلق یہ اعلان کیا "یدخلون فی دین الله أفواجا" اس سلبی پہلو کا التزامی نتیجہ یہ بھی ہے کہ ان (یہود و نصاریٰ) سے مل کر جب کبھی ہم کوئی کام کریں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ضلالت میں مبتلا ہو جائیں گے، یا اتنے مسخ ہو جائیں گے کہ خدا کے غضب کے سزاوار ہو کر مغضوب و معتوب ہو جائیں گے پس آج.. فطرت اس کی خوشنودگی کی قیمت متاع ایمان سے دست بردار ہونا ہے، پھر واقعات کی زبان میں ہم کو تاریخ کے مرقع سے یہی بتا رہی ہے کہ وہ ممالک جہاں مشرکین رہتے تھے مسلمان جب وہاں پہنچے تو خود ان میں جذب نہیں ہوئے بلکہ اکثر و بیشتر ان کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے اور وہ مسلمان ہو گئے ہیں اور وہ ممالک

اردو لائبریری ۳۸

جہاں یہود و نصاریٰ تھے، وہاں اکثر و بیشتر یہی ہوا کہ وہ اسلام سے مانوس نہیں ہوئے، پس اسلام کو مشرکین سے نہ کل اس طرح خطرہ تھا نہ آج ہے اور اگر یہود و نصاریٰ کی طرح ملت اسلامیہ کے لئے ان کا وجود بھی خطرناک ہوتا تو سلبی پہلو میں ان کو بھی شامل کیا جاتا۔

☆☆☆☆☆☆